آگ کی صلیب
ڈاکٹر صباحت عاصم واسطی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سبھی کے ہاتھ میں ہے آگ کی صلیب مگر
کسی کے سر پہ نہیں ہے غلاف کاغذ کا

کوائف

☆ ڈاکٹر صباحت عاصم واسطی

☆ والد : سید شوکت واسطی

☆ پیدائش : مردان 1957ء

☆ تعلیم : سینٹ میری کانونٹ سکول پشاور

☆ ایم بی ایس (خیبر میڈیکل کالج شمالی مغربی سرحدی صوبہ) 1982

☆ ایم آر سی پی (ا) آئرلینڈ 1992

☆ سینئر رجسٹرار لیڈز جنرل انفرمری لیڈز (برطانیہ)

☆ بحیثیت کنسلٹنٹ شیفیلڈ میں تعیناتی مارچ-1998

☆ رابطہ : 18 فلمر کورٹ گنگ ویل ٹڈلٹن-لیڈز (U.K)

ایل ایس 10، 13 ایچ بی-فون : 0113-2721008

تصانیف

○

پہلا مجموعہ..... کرن کرن اندھیرا..... 1989

(اباسین ایوارڈ یافتہ-پاکستان)

دوسرا مجموعہ..... آگ کی صلیب (پہلا ایڈیشن)..... 1995

(انٹرنیشنل ایوارڈ یافتہ-یو ایس اے)

آگ کی صلیب

ڈاکٹر صباحت عاصم واسطی

ادب برائے معاشرتی انقلاب

لاشئی خیر القول والنظر

۱۹۹۸

طبع	....	دوم - مارچ ۱۹۹۸ء
ناشر	....	بزم علم و فن انٹرنیشنل بریڈفورڈ (برطانیہ)
مطبع	....	اسلام آباد پرنٹرز، فضل حق روڈ، اسلام آباد
کمپوزنگ	....	**الخطاط** ندیم احمد خان
قیمت	....	8 پونڈ -/250 روپے 15 ڈالر

رابطہ

Bazm-e-Ilm-o-Fan International

Il-Shan Plaza, Blue Area, Islamabad

انتساب

پیاری ماں

راشدہ بیگم

کے نام

عرض ناشر

ہم بڑی مسرت بلکہ فخر کے ساتھ ڈاکٹر صباحت عاصم کے مجموعۂ کلام ''آگ کی صلیب'' کو بارِ دگر زیورِ طبع سے آراستہ کر رہے ہیں۔ نوجوان نسل کے اس شاعر نے اس میں شامل بیشتر نظمیں اور غزلیں برطانیہ میں کہیں جہاں وہ بدستور مقیم ہیں۔ ان کو برطانیہ اور امریکہ میں انتہائی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ جبکہ ان کا تیسرا مجموعہ کلام، جو تقریباً مکمل ہے منصہ شہود پر آنا چاہیے، وہ بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سلسلہ میں مزید توقف مناسب جانتے ہیں۔ لہٰذا ''آگ کی صلیب'' کو پھر طبع کیا جا رہا ہے کہ اس کتاب کی مانگ بالخصوص امریکہ میں بہت زیادہ ہے۔ برطانیہ میں بھی یہ دستیاب نہیں ہے۔ قدردانوں کے پیہم اصرار کے مدِ نظر صباحت عاصم کی یہ کلیات ہدیۂ قارئین ہے۔

ترتیب

تقریظ۔ محسن احسان	11
رب العالمین	13
نور راہ	15
کلو کلکس کلان کا شہر	20
ہمارے درمیاں دریا رہا ہے	22
وہ کبھی آخری یلغار نہیں کرتا ہے	23
دل ہے بے مہر تر اور درد مسلسل مانگے	25
متاعِ روشنی بے بہا چھپاؤں کیا	26
کیسے ہٹا کے شرم کا پردہ باہر آئے گا	28
محبتوں کا صحیفہ جہاں پر اترے گا	30
دعائیں	32
ڈی ژاوو	34
کوئی مشقتِ بے فائدہ کروں کیسے	36

جس خوں رنگ کو رنگین ہوا لکھا ہے	38
ندائے حق کے طرفدار ایک ہم ہی ہوئے	39
پھولوں میں نہیں ہے اب کے برس پہلی سی رمق رعنائی کی	41
آتی ہے سحر رات کا سایا نہیں جاتا	42
بے حال مچھلیاں ہوئی جاتی ہیں آب میں	44
نگرانی پندار سبو کون کرے گا	45
نہیں کہتا زباں سے کیا ہوا ہے	46
جہیز	47
ہماری بستی سے اس لئے بھی رہا ہے امن و سکوں گریزاں	49
امید جلوۂ مہتاب و آفتاب الگ	50
اگرچہ یوں تو کسی کا بھی میں غلام نہیں	51
دن ہار گیا رات کی تحویل میں آیا	52
تھکے ہوئے ہیں شکاری سبھی مچانوں میں	53
ہے خریدار سے اب چشم خریدار الگ	54
یوں ترا عکس مرے دیدۂ تر تک پہنچا	55
عکس رخ مہتاب سے واقف ہی نہیں ہے	56
شیزو فرینیا	57
میں دریاؤں کا سینہ چیرتا گیا	59
بدن ذرا بھی یہاں پائیدار کس کا ہے	61
اگر دماغ پر آسیب کا اثر رکھتا	63
بھائی بہنوں میں بٹ گئے کمرے	65
کیا کہہ رہی ہے تیز ہوا اپنے آپ سے	67
ہم نے یہ کیا کمال سر دار کر دیا	69
رہتا ہوں میں جہاں وہ نگر ہے خمار کا	71
خوش رنگ موسموں کے نئے خواب سوچتے	73

اداریہ	75
ذہن کے صاف اور ستھرے دل کے سب کو اچھے لگتے ہیں	78
روز کوئی انجانا اس کا پیکر ملتا ہے	80
ان لوگوں کا اپنے آپ سے یہ سمجھوتا رہتا ہے	81
میں عشق زخم زدہ کو وفائیں کیسے دوں	83
جو لوگ محو رہے ہیں شکار میں اپنے	84
یوں سردیوں کی دھوپ میں جل کے پگھل گئے	86
راجہ کے دھن دولت کو رانی نے سنبھالا کوئی نہیں	88
اپنے سلوک پہ وہ پشیماں ہوا تو ہے	89
ساحل کے عذاب	91
سو گئے ذکر صبح کر کر کے	94
اب جی کے سنبھلنے کا بہانہ نہیں ملتا	96
کم ذرا تو جسم کا ہیجان کر	97
اگا سکے ہی نہیں باہنر شجر کوئی	99
جو بھی روپ سجا لے لگتا نقلی ہے	101
عاصم مری زمیں کے خزینے کہاں گئے	102
بسا ہوا شہر ہے مگر مکڑیوں کے جالے پڑے ہوئے ہیں	104
جرأتِ کفر	105
آئینے دیدہ ور نہیں ہوتے	107
فون گم سم، بانگِ در خاموش	109
عکس کیسے دیکھتا مہتاب میرے شہر کا	110
افق کی گود میں سمٹا ہوا سویرا تھا	111
بڑے مکان رسوخ و اثر کی بیماری	113
مجھ کو کسی کے عکس نے ڈھانپا ہوا نہیں	114
رسمِ شہر	116

تیرے میرے درمیاں یہ فاصلے 117
جمال عکس سیاہی کو آزماتا رہا 118
بدن کو چاہتی ہے چیرنا تلوار بارش کی 120
کسی نظر میں کوئی بھی حسین خواب نہیں 121
گزرے ہوئے دلچسپ زمانے یاد آئے 122
وہ روشنی کو سراپا حجاب کردے گا 123
بڑے مکان کی چھوٹی نشانیاں لے کر 125
گئے سال کی آخری نظم 127
شیشے کے گھر نہ سوچے مسمار کیوں ہوئے 130
ہڑتال (قطعہ) 131
اس شہر میں کیوں رونق بازار نہیں ہے 132
لوگوں سے ہوئی جتنی شناسائی زیادہ 134
یو این او 135
روگ بنا کر بیٹھ گیا ہوں ایسا تیرے وعدے کو 137
ذرا سا دل میں مرے اضطراب رہنے دے 138
زندگانی کے لئے جیسے لہو لازم ہے 140
بے معنی کردو گے اپنے جملوں کو 141
تقدیر 143
نصف گواہی 145
بحرِ بے اماں 147
آبدیدہ الفاظ 149
مرتبے کی دعائیں مانگتے ہیں 151
ہے میرے واسطے سب کچھ مگر خدا تو نہیں 152
پیاس 154
متفرق اشعار 156

صباحت عاصم ---ایک توانا آواز

محسن احسان

شاعری وجود کے کرب کو لفظوں کے سانچوں میں ڈھالنے کا نام ہے۔ شاعر تجرید کو ایک حسیاتی شکل عطا کرتا ہے اور قوت متخیلہ سے اسے ہماری آنکھوں کے سامنے لانے کا ہنر جانتا ہے۔ صباحت عاصم کو میں نے زندگی اور شاعری دونوں کی منزلیں نہایت سرعت سے طے کرتے دیکھا ہے۔ مجھے اس کے وہ دن بھی یاد ہیں جب وہ تتلا تتلا کر لفظ ادا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ پھر اسے تعلیمی مراحل کی مختلف منزلیں عبور کرتے دیکھا پھر وہ ڈاکٹر بن گیا اور انگلستان جا کر آباد ہو گیا۔ وہاں تعلیم مکمل کی۔ گھر کی شاعرانہ فضا نے ڈاکٹر کے اندر ایک شاعر کو بھی آہستہ آہستہ ابھارنا شروع کیا۔ اسے ابتدا ہی سے وہ علمی و ادبی ماحول میسر آیا جو ایک تخلیقی ذہن کے لئے مہمیز کا کام کرتا ہے اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے صوبہ سرحد میں اپنے ہم عصروں کے درمیان ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر رہ کر اس نے تجربات و واردات کی ایک دنیا اپنے دامن میں سمیٹ لی۔ اس کے سینے کے اندر ایک نرم و نازک اور حساس دل نے اسے اول و آخر ایک صورت گر بنا دیا۔ ایک ذہن رسا رکھنے والا توانا اور ثابت قدم صورت گر......! اس کے تخیلاتی عکس آپ کو حقیقت سے آنکھیں دوچار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ آج کل وہ رنگوں اور نغموں کے اس LAKE DISTRICT میں رہتا ہے جہاں اس کے اندر کی چھپی ہوئی خواہشات اسے بار بار اپنی زمین اور اس کے مسائل کی طرف متوجہ رکھتی ہیں کیونکہ وہ غریب الوطن ہوتے ہوئے بھی اپنی مٹی کی بو باس کو ہمیشہ اپنے رگ و پے میں محسوس کرتا ہے۔ سفر، حرکت اور وطن سے دوری کا اضطراب اس کے فعال انداز فکر اور اس کی مسلسل جستجو کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔

دور کر سکتی نہیں یہ دوریاں　　فاصلوں کا ہیں زیاں یہ فاصلے
اپنی مٹی سے جو رشتہ ہے مرا　　توڑ سکتے ہیں کہاں یہ فاصلے

یا۔۔

غیر وطن میں آ کر ایک مکان بنایا ہے　　گھر کہتا ہے اس کو اپنا بے گھر ملتا ہے

سائنس کی تعلیم اور شعبۂ طب سے وابستگی نے صباحت عاصم کے شعری تخیلات کو سنوارنے اور نکھارنے میں مزید مدد دی۔ اس کے نئے خیالات، نیا اسلوب، نیا لب و لہجہ اور نئی تراکیب نے زبان کو وسعت عطا کی۔ غزل کی قدیم اساس کو قائم رکھتے ہوئے نئی تخلیقات قاری کی توجہ کا مرکز

بن جاتی ہیں۔ حب الوطنی اور بے وطنی کا شدید احساس اس کے رگ و پے میں لہو کی گردش کی طرح محو رقص ہے۔ "آگ کی صلیب" اس کے اندر کے الاؤ کا ایک استعارہ ہے اور اس کے تخلیقی سفر کی ایک دشوار گزار منزل۔ آگ کی صلیب میں وہ بظاہر تشکیک کی راہوں کا مسافر دکھائی دیتا ہے مگر تشکیک کی یہ فضا اس کی خود ساختہ نہیں، یہ بے یقینی کا کڑوا ثمر ہے۔ جس کے ذائقے میں وہ اپنی نظموں کے رسیلے خوابوں کی مٹھاس اور غزلوں کی پر کیف فضاؤں کا عطر گھول کر اس پھل کی تلخی کو فکر کی حلاوت اور اسلوب کی مٹھاس میں تبدیل کر دیتا ہے۔ تشکیک اور بے یقینی کی فضا میں وہ امن و محبت اور صلح و آشتی کا ایک پیامبر بن جاتا ہے۔ جو آنے والی نسلوں کو روشن مستقبل کی بشارت سنا رہا ہے، نوید دے رہا ہے:

ذہن میں ہونے بھی دے سورج طلوع
چشم کم احساس پر احسان کر
جسم کو آلودگی سے پاک رکھ
سانس لے عاصم ہوائیں چھان کر

آپ ہی عاصم ایک نہیں شیدائی حسین مناظر کے
یہ سرسبز پہاڑی رستے سب کو اچھے لگتے ہیں

صباحت عاصم کو یہ خبر ہے کہ شہر میں سب کو نور شناسی کا گمان تھا مگر جب سحر کے طلوع کی اطلاع پہنچی تو صرف جاگنے والا وہ خود ہی تھا اور شہر بے بصارت میں فیضِ دیدہ وری رکھنا حقیقتوں کے گنہگار ہونے کے موافق ہے، سو وہ یہ کہہ کر سکون کا سانس لیتا ہے کہ

سفر بھی کاٹ گیا گر ایک سا تو کیوں عاصم عذابِ راہ سے دو چار ایک ہم ہی ہوئے

وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ایک خاص اسلوب کو اپنانے میں کامیاب ہو رہا ہے۔ "آگ کی صلیب" ماضی کے ایک دور کی عکاسی ہے۔ یہ بارِ دگر شائع کی جا رہی ہے کیونکہ یہ صباحت عاصم کے کلام سے متاثر ہونے والوں کا مطالبہ ہے۔۔۔ ورنہ چاہیے تو یہ کہ وہ اپنی ۱۹۹۵ء کے بعد کی شاعری کو سامنے لائے۔۔۔ اس بارے میں شاعر کو جو توقف ہے وہ قابلِ فہم ضرور ہے تاہم یہ طویل مدت تک نہ رہنا چاہیے۔ آیندہ مجموعے میں وہ یقیناً مزید پختگی اور شگفتگی کا ثبوت بہم پہنچائے گا۔ بہر حال "آگ کی صلیب" کا نقشِ ثانی پیش کرنے پر میں اسے تحسین کہتا ہوں۔

حمد

رب العالمین

کہا اس نے یہ مجھ سے
خدا میرا
کہیں تیرے خدا سے معتبر ہے
کہ وہ
پائندہ تر ہے
اسی کے حکم سے
دنیا میں یہ زیر و زبر ہے
گردشِ شام و سحر ہے
خزاں کی فتنہ دستی ہے

بہاروں کا نہایت نرم دستِ باہنر ہے
حریمِ غنچۂ صد خوشنما ہے
یہ ویرانی ہے صحرا کی
پہاڑوں کی بلندی ہے
کہ میدانوں کی پستی ہے
درختوں پہ ثمر ہیں
اور کھیتوں میں اناج
ہمارے واسطے ہیں
پھل، یہ دانے، اور شیریں آب
مگر کس کو ملے گا کیا
اسی کے حکم کے زیرِ اثر ہے
خدا میرا
کہیں تیرے خدا سے معتبر ہے
میں اس کی بات سنتا جا رہا تھا
مجھے تکرار میں اس کی
خدا اپنا دکھائی دے رہا تھا
میں اپنے دل میں سوچے جا رہا تھا
کہ جو میرا خدا ہے
وہ اس کا بھی خدا ہے
یہ ساری بحث بے معنی بپا ہے

*

نورِ راہ

سیاہ شب ہے
گھنی دھند ہے
سفر ہے طویل
میں اپنی کار میں تنہا
رواں دواں پیہم
تھکا تھکا سا بدن
کہہ رہا ہے جلدی کر
نگاہ چاہتی ہے چیرنا اندھیرے کو
ذرا سی دور مگر دیکھنا مشقت ہے
میں اپنی سیٹ پہ بیٹھا ہوں مستعد ہو کر
چلا رہا ہوں مگر ہچکچا کے کار کو میں
کہیں تو تیز

کہیں انتہائی آہستہ
مجھے یہ ڈر ہے
کہ اس دھند
اس اندھیرے میں
بڑی چٹان کھڑی ہے
سڑک کو روکے ہوئے
کمی ذرا بھی اگر آئی ہوشیاری میں
کچل نہ ڈالے کہیں
مجھ کو میری کار سمیت
سفر کے سخت عذابوں سے میں سسکنے لگا
نظر اٹھا کے فلک کی طرف
کیا شکوہ
مرے خدا یہ ستم یہ عذاب
کیوں آخر
چلا تھا میں تو سفر پر
اسی بھروسے پر
کہ راہ بر تو ہے
یہ سوچتا تھا
کہ کیسی عجیب بات ہوئی
مرے وجود کے اندر سے روشنی اٹھی
ہر ایک چیز نگاہوں میں جگمگانے لگی
سڑک کی آخری حد تک نگاہ جانے لگی

*

روشنی کا سفیر

سحر کا سورج
حصارِ شب میں گھر ہوا تھا
کوئی جبیں بھی نہیں تھی
جو اس کے سامنے سجدہ ریز ہو کر
کرن کرن کو دوام دیتی
نظر کو دن کا پیام دیتی
بصارتوں کا کوئی دریچہ نہیں کھلا تھا
دیارِ بینائی سارا جیسے اجڑ گیا تھا
سحر کا سورج
حصارِ شب میں گھرا ہوا تھا

سحر کے سورج کی بے بسی کو

خدائے انوار نے جو دیکھا
تو اس کی رحمت کو جوش آیا
تمام ذراتِ نورِ رقصاں کو
خاکِ دانائی میں ملایا
اور اس سے ایک آدمی بنایا
جو روشنی کا سفیر بن کر زمیں پر آیا
سسکتی نظروں، بلکتی آنکھوں کی
تیرہ و بے چراغ بستی میں اس نے جا کر
خدائے انوار کا پیامِ سحر سنایا
بڑے مصائب اٹھائے لیکن
بڑی لگن سے
بڑی محبت سے
روشنی کا چمن اگایا
قبیلۂ روشنی بنایا
مہیب اندھیروں کی رخصتی کا پیام لایا
زمین کے ایک ایک کونے کو جگمگایا

سحر کا سورج
حصارِ شب میں گھرا گھرا ہے
وہ ساری نظریں
جو اس کے آگے جھکی ہوئی تھیں
بجھی ہوئی ہیں
وہ سب جبینیں

جو سجدۂ نور کی مشقت اٹھا رہی تھیں
لہو لہو ہیں
قبیلۂ روشنی اندھیروں میں گھر گیا ہے
چمن ہر اک روشنی کا جیسے اجڑ گیا ہے
سحر کا سورج
حصارِ شب میں گھرا گھرا ہے

خدائے انوار
تجھ سے بس ایک التجا ہے
تمام آنکھوں کو روشنی کے سفیر کی وسعتِ نظر دے
تمام ذہنوں میں
اس کا دانا شعور بھر دے
سبھی قبیلۂ روشنی!
کہ بہت سے فرقوں میں بٹ گیا ہے
پھر ایک کر دے
چمن ہر اک روشنی کا یا رب نکھار دے پھر
ہماری سوچوں' ہمارے ذہنوں میں
روشنی کے سفیر کا
دلنشین پیکر
سنوار دے پھر

کلو کلکس کلان کا شہر

رواج عام ہے مکروہ وحشتوں کا یہاں
ہر ایک ذہن کو مفلوج کرچکا ہے جنون
خرد اسیر ہوئی خاردار تاروں میں
تمام شہر کا قانون ہو گیا ہے جنون

کرختگی ہی سجی ہے ہر ایک چہرے پہ
لبوں کو بھول گیا مسکراہٹوں کا ہنر
ہر اک ذہن میں ہے آزاد تلخ لہجہ زباں
کسی کو یاد نہیں نرم گفتگو کا اثر

تمام فیصلے جذبات کرتے جاتے ہیں
شعور سہما ہوا ہے شکست خوردہ ہے
کسی بھی ہاتھ کو ترکیبِ ضبط یاد نہیں
قبائے صبر و تحمل میں جسم مردہ ہے

کلوکلکس کلان اپنا شہر ہے سارا
جو مختلف ہیں یہاں مستقل عذاب میں ہیں
ستم گروں کو ہے آزادیٔ ستم گاری
ستم رسیدہ مگر آہنی نقاب میں ہیں

عذاب بانٹ رہے ہیں یہ لوگ برسرِعام
ہے اب ستم کا بہت سودمند کاروبار
نہیں ہے ظلم کو اب احتساب کا خطرہ
نہیں ہیں جبر کے چہرے پہ شرم کے آثار

خیالِ فلسفۂ درگذر نہیں کوئی
ہے انتقام کی بنیاد پر جہاد ان کا
ذرا بھی رحم کی تہذیب سے نہیں واقف
نہیں کرم کی شریعت پہ اعتقاد ان کا

مٹا چکے ہیں یہ تحریرِ خامۂ رحمٰن
لبادہ اوڑھ کے نکلے ہیں صاف کاغذ کا
سبھی کے ہاتھ میں ہے آگ کی صلیب مگر
کسی کے سر پہ نہیں ہے غلاف کاغذ کا

KLUKLUXKLAN مشہور سفید فام خونی تحریک جس کے رکن اذیت دینے یا قتل کرنے سے پہلے اپنے سر پر کاغذ کا غلاف چڑھا لیتے ہیں۔ (یہاں یہ تکلف بھی روا نہیں)

✧

ہمارے درمیاں دریا رہا ہے
کہیں اتھلا کہیں گہرا رہا ہے

بچھائے راستے میں جس نے کانٹے
مرے تلوے بھی وہ سہلا رہا ہے

خیالوں میں ہی چھو لیتا ہوں تجھ کو
گماں احساس بنتا جا رہا ہے

سناتا ہے مجھے باتیں پرانی
نئے معنی مگر پہنا رہا ہے

اسے کیا خوف مر جانے کا ہو گا
جو ساری عمر ہی مرتا رہا ہے

ہمیں بھی سابقہ ہے مکڑیوں سے
ہمارے گرد بھی جالا رہا ہے

ہر اک جانب ہے خاموشی سی عاصم
کوئی طوفان گویا آ رہا ہے

○

✧

وہ کبھی آخری یلغار نہیں کرتا ہے
جیت ممکن ہو اگر، وار نہیں کرتا ہے

راہ بر خواب دکھاتا تو ہے منزل کے مگر
راستے کے لئے تیار نہیں کرتا ہے

میں نے جس شخص کو خود سے بھی زیادہ چاہا
وہ مجھے میری طرح پیار نہیں کرتا ہے

ایک وہ شخص ہی مجرم ہے مری بستی میں
جو کسی جرم کا اقرار نہیں کرتا ہے

جس کے آسیب سے ہیں خوفزدہ شہر کے لوگ
وہ محل کوئی بھی مسمار نہیں کرتا ہے

کھیل میں کر بھی لیا ہے مجھے شامل اس نے
اور واضح مرا کردار نہیں کرتا ہے

ہنس کے ملنے سے قیامت تو نہیں آ جاتی
مسکرا دینا گنہگار نہیں کرتا ہے

متفق بھی نہیں ہوتا ہے وہ مجھ سے عاصم
اپنی رائے کا بھی اظہار نہیں کرتا ہے

○

✧

دل ہے بے مہر ترا درد مسلسل مانگے
آنکھ کی سمٹی ہوئی جھیل میں جل تھل مانگے

ہے انا ایسی کیا خون سے سیراب مگر
ہم نے گیہوں نہ کبھی کھیت سے چاول مانگے

دھوپ مانگی تو پگھلتا رہا سڑکوں کا بدن
غرقِ سیلاب ہوئے شہر جو بادل مانگے

جس نے تقسیم کیا جسم مرا ٹکڑوں میں
اس کی تصویر مری آنکھ مکمل مانگے

دستکاروں کے انگوٹھوں کو قلم کر کے اب
شاہِ افرنگ چمکتی ہوئی ململ مانگے

ذہن سفاک ہوئے جاتے ہیں اتنے عاصم
دیدۂ شوق سلگتا ہوا مقتل مانگے

○

✧

متاعِ روشنیِ بے بہا چھپاؤں کہاں
ہوا کے شہر میں کوئی دیا جلاؤں کہاں

ہر ایک شخص تجھے دیکھنے کا خواہاں ہے
بڑا ہجوم ہے، اپنی جگہ بناؤں کہاں

قدم قدم پہ خدا ہیں خدا مزاج بھی ہیں
ہے آشنائے طریقت یہ سر، جھکاؤں کہاں

ہے بادشاہ کو خطرہ ہر ایک جانب سے
بٹھاؤں فیل کہاں اور وزیر لاؤں کہاں

زمین تنگ ہوئی، بڑھ رہی ہے آبادی
نئے مکان نئی بستیاں بساؤں کہاں

مکاں نشیب میں ہے اور عدو بلندی پہ
کوئی فصیلِ حفاظت کہو اٹھاؤں کہاں

میں پھول توڑ تو لایا ہوں باغ سے لیکن
سمجھ میں یہ نہیں آتا ہے اب سجاؤں کہاں

نہیں تناؤ کوئی سطحِ آب میں عاصم
کہو سفینۂ فولاد یہ چلاؤں کہاں

○

✧

کیسے ہٹا کے شرم کا پردہ باہر آئے گا
کون برہنہ ہو کر اپنے زخم دکھائے گا

جوں جوں وقت قریب آئے گا تیرے ملنے کا
خوں کا دباؤ دل کا دھڑکنا بڑھتا جائے گا

ایک مگرمچھ سارے شناور جس نے چاب لئے
پانی سے باہر آیا تو اشک بہائے گا

کوڑا کرکٹ اپنے گھر کا کون دکھاتا ہے
میلے کپڑے کون گلی میں دھونے لائے گا

آج شہید ہوا ہے جو سچائی کی خاطر
وہ بستی کی گلیوں میں پاگل کہلائے گا

مالک جس کا کاہل ہے اور مٹی ہے بے وصف
ابر بھلا اس کھیت پہ کیوں بارش برسائے گا

ایسا مصور جس کی آنکھیں اندر جھانکتی ہیں
الجھی ہوئی ریکھاؤں سے تصویر بنائے گا

عشق کے کاروبار میں پیارے صرف خسارہ ہے
کب تک سود پہ قرضے لے کر کام چلائے گا

بھوک کی شدت، خواب بھیانک جو بھی ہے عاصم
بچہ روتے روتے آخر سو ہی جائے گا

○

✧

محبتوں کا صحیفہ جہاں پہ اترے گا
بہشتِ نور کا زینہ وہاں پہ اترے گا

مرے مکاں پہ سگِ مشتعل کا قبضہ ہے
عنایتوں کا فرشتہ کہاں پہ اترے گا

ہے اختلاف پرندوں کا تنکے تنکے پہ
نیا عذاب کوئی آشیاں پہ اترے گا

یہ شہرِ کذب ہے کیسے کوئی یہاں پورا
صداقتوں کے کسی امتحاں پہ اترے گا

مکان لوٹ رہے ہیں مکین خود اپنا
تمام قہر مگر پاسباں پہ اترے گا

اگر نہیں ہے وہ عکسِ سراب دشت طلب
تو آبِ سرد کی صورت زباں پر اترے گا

اگا ہے صحن میں سورج عذاب کا، کیسے
کوئی بھی سایۂ رحمت مکاں پر اترے گا

یہ قحط کھا بھی چکا سارے شہر کو عاصم
اناج لے کے جہاز اب یہاں پر اترے گا

○

دعائیں

شعورِ لغزشِ تحقیق و تجربہ دے دے
ہر اک یقیں کو مرے شک کا واہمہ دے دے

دے اعتماد کہ تنقید سن سکوں خود پر
مجھے قرینۂ بحث و مباحثہ دے دے

ہر ایک شخص مرے قافلے کا ساکت ہے
ہر ایک پاؤں کو بے چین آبلہ دے دے

بھٹک گیا تو نئی منزلیں ملیں گے مجھے
مرے خدا کوئی گم کردہ راستہ دے دے

ترے کرم پہ ہمیں پھر یقین آجائے
گناہ کرنے کا تھوڑا سا حوصلہ دے دے

بس اک طرف سے ہی منظر کو دیکھتے ہیں یہ لوگ
اب ان کی آنکھ کو ایک اور زاویہ دے دے

بدن میں جھانک کے روحوں کو منعکس کر دے
اب آگہی کا کوئی ایک آئینہ دے دے

کبوتروں کی طرح سب کی بند ہیں آنکھیں
کسی کو جرأتِ تحقیقِ حادثہ دے دے

ہر ایک آنکھ میں یارب اگا نیا سورج
ہر اک نگاہ کو کرنوں کا ذائقہ دے دے

ہر ایک شخص ہے قانونِ کذب کا پابند
صداقتوں کا کوئی ایک ضابطہ دے دے

کوئی برائی کرے بھی تو بھول جاؤں میں
مرے خدا مجھے کمزور حافظہ دے دے

○

ڈی ژاوُو
(Deja vu)

میں تیرے شہر میں آیا ہوں آج پہلی بار
نگاہِ شوق نئے منظروں کو ڈھونڈتی ہے
عجیب بات ہے لیکن مری نظر کے لئے
یہاں کی چیز کوئی بھی نہیں ہے نامانوس
عمارتیں یہ قدیم و جدید' پست و بلند
مری نگاہ سے ملتی ہیں آشنا کی طرح
چلا نہیں ہوں
میں جن راستوں پہ پہلے کبھی
بتا رہے ہیں مجھے

میں یہاں سے گزرا ہوں
جدھر بھی دیکھتا ہوں
مجھ کو ایک بھی منظر
جدید بھی ہے اگر اجنبی نہیں لگتا
بڑا عجیب سا احساس ہو رہا ہے مجھے
یہ سارا شہر ہے میرے شعور کی تخلیق
مرے وجود کے اندر ہیں اس کی بنیادیں

✧

کوئی مشقتِ بے فائدہ کروں کیسے
جدھر نہیں کوئی منزل ادھر چلوں کیسے

جہاں روایتِ کذب و ریا روا ہے، وہاں
صداقتوں کی کوئی داستاں کہوں کیسے

قمیض، ٹائی، جرابیں پسند آئیں، مگر
ترے بغیر کوئی فیصلہ کروں کیسے

نہیں ہے تیرے بدلنے پہ صرف آزردہ
ہے دل کو یہ بھی تجسس ہوا یہ کیوں، کیسے

اگر تمازتِ جاں قید ہے بدن میں ابھی
رگوں میں جم سا گیا ہے تمام خوں کیسے

یہ دل کسی کی طرف تیز تیز دوڑتا ہے
میں خواہشات کو اپنی لگام دوں کیسے

اک اختلاف مرے جسم اور روح میں ہے
میں درمیان سے اپنے بھلا ہٹوں کیسے

میں خود کو چھوڑ تو دوں اس کے واسطے عاصم
پر اپنے آپ سے ہو کے جدا رہوں کیسے

○

✧

جسِ خوں رنگ کو رنگین ہوا لکھا ہے
کچھ ادیبوں نے اندھیرے کو ضیا لکھا ہے

ہم نے اس شہر کی گرتی ہوئی دیواروں پر
خون کے رنگ سے پیمانِ وفا لکھا ہے

شہرِ توحید ہے، یہ شرک یہاں عام ہوا
ایک اک شخص کے ماتھے پہ خدا لکھا ہے

مرتبہ آپ کا بھی ہے مرے جیسا لیکن
آپ نے اپنے کوائف کو بڑا لکھا ہے

ہے ہر اک شخص کو ہی نیک روی کا دعویٰ
کس نے اس شہر کا قانونِ ریا لکھا ہے

اس لئے ہیں یہ مرے شعر مقدس عاصم
میں نے ہر لفظ بہ اندازِ دعا لکھا ہے

○

✧

ندائے حق کے طرفدار ایک ہم ہی ہوئے
صلیب اس لئے ہر بار ایک ہم ہی ہوئے

تمام شہر نے پھانکی ہوائے آلودہ
عجیب بات ہے بیمار ایک ہم ہی ہوئے

تری اداؤں کے قائل ہیں سارے شہر کے لوگ
ترے فسوں میں گرفتار ایک ہم ہی ہوئے

ہر ایک شخص کو منزل کا چاؤ تھا لیکن
سفر کے واسطے تیار ایک ہم ہی ہوئے

گمان نور شناسی کا سب کو تھا لیکن
سحر ہوئی ہے تو بیدار ایک ہم ہی ہوئے

بہت سے لوگ ہیں بے روزگار بستی کے
ہر اعتبار سے بیکار ایک ہم ہی ہوئے

بہ فیضِ دیدہ وری شہرِ بے بصارت میں
حقیقتوں کے گنہگار ایک ہم ہی ہوئے

سفر سبھی کا تھا گر ایک سا تو کیوں عاصم
عذابِ راہ سے دوچار ایک ہم ہی ہوئے

○

✧

پھولوں میں نہیں ہے اب کے برس پہلی سی رمق رعنائی کی
اس بار بہاروں نے جانے یہ کیسی چمن آرائی کی

ہوتا ہے اندھیرا جب باہر اندر سے ابھرتا ہے منظر
بے نور نگاہوں میں میں نے دیکھی ہے چمک بینائی کی

ہم لوگ بدیس میں رہتے ہیں ہمراز بھی کم ہم فکر بھی کم
ہم سے پوچھو کیا ہوتی ہے نوکیلی چبھن تنہائی کی

یہ روشنیوں کا شعبدہ ہے تالاب جو اتھلا لگتا ہے
جب پاؤں رکھو گے پانی میں تب ہو گی خبر گہرائی کی

تہذیب بھی ہے ترتیب بھی ہے تعلیم بھی ہے تفہیم بھی ہے
بھائی کو مگر پہچان نہیں اس شہر میں اپنے بھائی کی

فرسودگیِ اقدار سے ہی کرنی ہے بغاوت عاصم تو
باتوں سے کسی کی ڈرنا کیا، کیوں فکر کوئی رسوائی کی

○

✧

آتی ہے سحر رات کا سایا نہیں جاتا
پردوں کو دریچوں سے ہٹایا نہیں جاتا

ہر شخص تو ہمراز یا ہمدرد نہیں ہے
افسانۂ دل سب کو سنایا نہیں جاتا

مٹی میں کھنڈر ڈھونڈ ہی لیتی ہیں ہوائیں
تاریخ کا ہر نقش مٹایا نہیں جاتا

تحفے میں مجھے اس نے دیئے پھول ذرا سے
کمرے کو سجاتا ہوں سجایا نہیں جاتا

یہ شہر اندھیروں کا پجاری ہے سراسر
سورج کو یہاں سر پہ بٹھایا نہیں جاتا

ہیں لوگ غلافِ شبِ تاریک میں محفوظ
بستی میں چراغوں کو جلایا نہیں جاتا

دکھ کس نے دیا ہے یہ نہیں کہتا ہوں لیکن
اشکوں میں ترا عکس چھپایا نہیں جاتا

امداد انا مانگنے دیتی نہیں عاصم
ہر بوجھ اکیلے بھی اٹھایا نہیں جاتا

○

✧

بے حال مچھلیاں ہوئی جاتی ہیں آب میں
تبدیل ہو رہا ہے سمندر حباب میں

ہر بار نوجوان لہو رائیگاں گیا
ہر بار کوئی نقص رہا انقلاب میں

تیرے سبب سے ہے مری آنکھوں میں رنگ و بو
تیرے بغیر حسن نہیں ہے گلاب میں

ساقی کو آ گیا ہے علاجِ غمِ مہیب
دینے لگا ہے زہر ملا کر شراب میں

باقی نہیں نظر میں وہ پہلی سی لغزشیں
چہرہ چھپا رہے ہو بھلا کیوں نقاب میں

عاصم سفر یہ برف کا ہے اور آپ کے
دستانے ہاتھ پر ہیں نہ پاؤں جراب میں

○

✧

نگرانیِ پندارِ سبو کون کرے گا
میخانے کو اب نذر لہو کون کرے گا

مانا کہ جراثیم تو مر جائیں گے سارے
جلتے ہوئے پانی سے وضو کون کرے گا

سورج کے تعاقب میں تو ہے شہرِ نگاراں
برداشت یہاں دھوپ یا لو کون کرے گا

غم اپنا نہیں صرف، مجھے فکر ہے یہ بھی
دشمن کا گریبان رفو کون کرے گا

کس طرح کروں آپ کے وعدے پہ یقیں میں
تبدیل بھلا آپ کی خو کون کرے گا

عاصم ہیں بڑے شستہ و شائستہ مزاج آپ
فرمایئے توہینِ عدو کون کرے گا

○

✧

نہیں کہتا زباں سے کیا ہوا ہے
مگر مرنے کی باتیں کر رہا ہے

مری عریانیاں ڈھانپے ہوئے ہے
اگرچہ ایک معمولی قبا ہے

شعور ان کو نہیں ہے راستوں کا
ہمیں جن رہبروں سے آسرا ہے

اسے اندر سے کھائے جا رہی ہے
وہ جس تکلیف میں بھی مبتلا ہے

نظر آتا نہیں ملبہ ذرا سا
نجانے کیسے میرا گھر گرا ہے

سفر کا مرحلہ پہلا ہے یہ تو
ابھی سے حوصلہ ٹوٹا ہوا ہے

میں کیوں رونے سے کتراؤں گا عاصم
ہر اک آنسو مرا اس کی عطا ہے

○

جہیز

بے وجود دوشیزہ
حجلۂ عروسی میں
سج سجا کے بیٹھی ہے
بے نمائشی گڑیا
لوگ آتے جاتے ہیں
اور اٹھا اٹھا گھونگھٹ

چہرۂ سراسیمہ
دیکھ دیکھ کر اس کا
غم زدہ ہتھیلی پر
سکے رکھتے جاتے ہیں

حجلۂ عروسی کے
گرد ہے جگہ خالی
دیکھ دیکھ کر جس کو
ساس اور نندیں سب
تلملائے جاتی ہیں
دل ہی دل میں کڑھتی ہیں

بے وجود دوشیزہ
کھنکھناتے سکوں کو
دیکھتی ہے روتی ہے
اور سوچے جاتی ہے
اس کا چہرۂ مایوس
کل جو بک گیا ہوتا
والدین اس کے بھی
باوجود لالچ کے
اس کو ساتھ کر دیتے
اور اس کا مستقبل
تابناک کر دیتے

✧

ہماری بستی سے اس لئے بھی رہا ہے امن و سکوں گریزاں
نظر میں نفرت سجی ہوئی ہے محبتوں کا فسوں گریزاں

شکست خوردہ روائتیں کس طرح سے تبدیل ہو سکیں کی
خرد ستم سے ڈری ڈری ہے' رہا ہے دستِ جنوں گریزاں

مجھے یہ خطرہ ہے میرے سارے شکوک ہونگے درست ثابت
میں اس لئے تیری نقل و حرکت پہ آنکھ رکھنے سے ہوں گریزاں

طبیعت اکتا کے مجھ کو اکسا رہی ہے دروازہ کھٹکھٹا دوں
میں اور کب تک ترے مکاں کے قریب بیٹھا رہوں گریزاں

نہیں کہ پہلے نہیں رہا اپنے درمیاں اختلاف کوئی
مگر ہیں ملنے سے جیسے اب کے کبھی ہوئے تھے نہ یوں گریزاں

بڑھی ہے تکلیف اس سے مل کے کچھ اس طرح میرے دل ی عاصم
ہر ایک شریانِ دل سے جیسے ہوا ہو دورانِ خوں گریزاں

○

✧

امیدِ جلوۂ مہتاب و آفتاب الگ
رہے ہیں شہر میں ہر آدمی کے خواب الگ

سنا رہا ہے جو نفرت کی آیتیں مجھ کو
ہے اس امام کا مذہب الگ کتاب الگ

معززین کی فہرست مختلف ہو گی
ہوا اگر کبھی چہروں سے یہ نقاب الگ

دیا تھا اس کو شگفتہ حسین گلدستہ
وہ مانگتا ہے مگر ایک اک گلاب الگ

رہا نہیں ہے نظر میں کمالِ جراحی
میں کیا کروں گا بھلا دشت سے سراب الگ

غلط ہے بانٹتا یہ شہر خاندانوں میں
میانِ بحر نہیں راوی و چناب الگ

مجھے خبر ہے کہ مچھلی کی زندگی عاصم
برونِ آب الگ ہے درونِ آب الگ

○

✧

اگرچہ یوں تو کسی کا بھی میں غلام نہیں
مرا مکان مرے زیرِ انتظام نہیں

کسی کتاب کو سمجھے بغیر پڑھ لینا
ہے لفظ لفظ کی توہین، احترام نہیں

ہمارے شہر میں کیوں اتفاق رائے سے
کئی برس سے ہوا کوئی ایک کام نہیں

انا نے خوف نے خدشوں نے کر دیا ہے دور
وگرنہ ترا مکاں مجھ سے چند گام نہیں

ہے جرم رسم محبت نگاہِ واعظ میں
مگر مشقتِ ظلم و ستم حرام نہیں

کبھی ہمارے مراسم بڑے قریبی تھے
اب ایک عمر سے عاصم دعا سلام نہیں

○

✧

دل ہار گیا رات کی تحویل میں آیا
افسانہ ہوا منظرِ تمثیل میں آیا

کرنی نہ کوئی بات مجھے مختصر آئی
اور سامنے جو راز تھا تفصیل میں آیا

پانی کی ہر اک بوند نے جھانکا مرے اندر
اک شخص پریشاں سا نظر جھیل میں آیا

لگتا ہے تو لگ جائے مرے جسم پہ محصول
میں جان لٹانے تری تحصیل میں آیا

کتنے ہی جواں جسم گئے جان سے عاصم
آسان کہاں شہر یہ تشکیل میں آیا

○

✧

تھکے ہوئے ہیں شکاری سبھی مچانوں میں
پرندے چین سے سو جائیں آشیانوں میں

زمیں کا جسم تو جھلسا چکے ہیں، اب یہ لوگ
لڑیں گے جنگ ستاروں کی آسمانوں میں

میں اس لئے نہیں لکھتا ہوں داستانِ دل
تمہارا نام بھی آئے گا ان فسانوں میں

رہے خیال وہ سرگوشیاں بھی سن لے گا
پکارتے ہیں جسے لوگ آسمانوں میں

میں تیرے دیر سے آنے کی مانگتا ہوں دعا
بڑی عجیب کشش ہے ترے بہانوں میں

سمجھ سکے نہ ہوا کی روش کو ہم عاصم
رہے سکون سے ان ریت کے مکانوں میں

○

✧

ہے خریدار سے اب چشمِ خریدار الگ
قوتِ زر سے ہوئی رونقِ بازار الگ

چل سکوں گا میں ترے ساتھ سفر میں کیونکر
میری رفتار الگ ہے تری رفتار الگ

کی گئی ہے جو مری ذات سے منسوب تمام
اس کہانی سے رہا ہے مرا کردار الگ

اے خدا سجدہ فروش اور ہیں بے سجدہ اور
تیرے مجرم ہیں الگ تیرے گنہگار الگ

سر کے کٹنے کا بھی ہے خوف مسلسل عاصم
اور بے چین ہے یہ جراَتِ اظہار الگ

○

✧

یوں ترا عکس مرے دیدۂ تر تک پہنچا
جس طرح چاند کسی جھیل نگر تک پہنچا

میرے ہر انگ کو سلگا کے کیا قتل مجھے
جسم سہلاتا ہوا ہاتھ وہ سر تک پہنچا

لے گئے توڑ کے پھل اونچے مکانوں والے
ہاتھ میرا نہ مگر اپنے شجر تک پہنچا

منتقل خون جراثیم نہیں کرتا اگر
آبلہ کیسے مرے دل کا جگر تک پہنچا

کس مہارت سے ہر اک داغ چھپایا ہم نے
زخم کھانے کا سلیقہ بھی ہنر تک پہنچا

گھر پہنچ کے بھی سفر ختم ہوا کب میرا
اپنی منزل سے چلا راہ گزر تک پہنچا

عام منڈی میں ہے کج فہم تجارت عاصم
دستِ بے وصف ہر اک چشمۂ زر تک پہنچا

○

✧

عکسِ رخِ مہتاب سے واقف ہی نہیں ہے
وہ آنکھ تو تالاب سے واقف ہی نہیں ہے

کیا دیجئے اس کو کوئی الزام جفا کا
وہ عشق کے آداب سے واقف ہی نہیں ہے

دریا کے سفر پر جو ہمیں لے کے چلا ہے
وہ آب سے گرداب سے واقف ہی نہیں ہے

میں جس کو سمجھتا رہا تعبیر کا حاصل
وہ شخص مرے خواب سے واقف ہی نہیں ہے

ترکیب بتاتا ہے بچاؤ کی جو ہم کو
وہ شدتِ سیلاب سے واقف ہی نہیں ہے

ملتا ہوں جنہیں روز بڑے شوق سے عاصم
یہ دل تو ان احباب سے واقف ہی نہیں ہے

○

شیزو فرینیا

(مختلف النوع اختلالِ ذہنی)

مرے پاس نہیں ہے تو لیکن
میں پھر بھی تجھ کو دیکھتا ہوں
دیوار پہ تیرے بکھرے ہوئے
خوش رنگ نقوش سمیٹتا ہوں

تو کہتا نہیں ہے کچھ بھی مگر
تیری باتوں میں کھو جاتا ہوں
تو جیسا مجھ سے کہتا ہے
میں ویسا ہی ہو جاتا ہوں

تو مجھ سے روٹھ نہ جائے کہیں
یہ سوچ کے ڈرتا رہتا ہوں
اس واسطے جو تو کہتا ہے
میں وہ ہی کرتا رہتا ہوں

تو مل کے رقیب کے ساتھ مجھے
کردے گا قتل میں جانتا ہوں
تیری پیار بھری ان باتوں میں
جو نفرت ہے پہچانتا ہوں

کرلوں گا خود کو قتل مگر
کوئی حرف نہیں تجھ پر آئے
شریانیں کاٹ کے بیٹھا ہوں
کہ جان بدن سے بہہ جائے

✧

میں دریاؤں کا سینہ چیرتا کیا
مری للکار کیا میرا عصا کیا

وہ اندر سے بظاہر مر چکا ہے
زباں سے یہ نہیں کہتا ہوا کیا

ذرا سی دیر کو آیا ہے ملنے
تمنائیں مگر دل میں ہیں کیا کیا

بہت دلچسپ ہوتا ہے تغیر
"نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا"

مرا گھر جل چکا تو یار میرے
یہ مجھ سے پوچھنے آئے بچا کیا

یونہی چلتا رہے گا کارِ ہستی
مرا ہونا نہ ہونا ہے بھلا کیا

وہ اب ملتا نہیں ہے مسکرا کر
نجانے ہو گئی مجھ سے خطا کیا

دھواں کیوں ہر طرف سے اٹھ رہا ہے
یہ میرا شہر پورا جل گیا کیا

بدن شفاف تھا شیشے سا جس کا
وہ آئینے میں عاصم دیکھتا کیا

○

✧

بدن ذرا بھی یہاں پائیدار کس کا ہے
فنا کا کھیل ہے سب، اعتبار کس کا ہے

جو اقتدار میں ہیں وہ تو دست بستہ ہیں
ہمارے شہر پہ اب اختیار کس کا ہے

کمی ذرا سی نہیں اضطراب میں آئی
وہ آ چکا ہے تو اب انتظار کس کا ہے

یہ کس کے جسم کو پانی نے کر دیا پتھر
مجسمہ یہ لبِ آبشار کس کا ہے

یہ کون ظلم کے آلات کر رہا ہے فروخت
ستم کا بڑھتا ہوا کاروبار کس کا ہے

دعا لبوں پہ مرے بھی رہی عدو کے بھی
خدا ہے ایک، وہ پروردگار کس کا ہے

ہوائیں کھلتے ہوئے پھول نوچ لیتی ہیں
یہ انتظامِ شکستِ بہار کس کا ہے

خود اپنے ذہن سے کیوں سوچتا نہیں ہوں میں
مرے بدن کے لہو میں فشار کس کا ہے

یہ کون بیچنے آیا ہے ملکیت میری
مرے مکان پہ یہ اشتہار کس کا ہے

ہے ٹوٹنے کا مجھے خوف مستقل عاصم
میں جس میں گھوم رہا ہوں مدار کس کا ہے

○

✧

اگر دماغ پہ آسیب کا اثر رکھتا
خیال و فکر میں بھی بے وجود ڈر رکھتا

اگر میں ہوتا اسیرِ طلسمِ مال و متاع
تو خوئے حرص و تقاضا سنبھال کر رکھتا

نہیں تھا میرے تعاقب میں کوئی پیکرِ نور
میں اپنے سائے پہ کیسے بھلا نظر رکھتا

اگر مکان کے مضبوط بام و در ہوتے
تو نیند آنکھ میں محفوظ رات بھر رکھتا

سفر کبھی نہیں ہوتا تمام صحرا کا
قدم قدم پہ اگر سایۂ شجر رکھتا

کسی کو سجدۂ ابلاغ کا شعور نہ تھا
میں کس کے سامنے پیشانیِ ہنر رکھتا

تجھے میں دیکھ نہ سکتا حسیں مناظر میں
نظر میں خوف ترے قہر کا اگر رکھتا

بھنور ہواؤں کا تھا ثقل کی کشش سے قوی
میں پاؤں کیسے جما کر زمین پر رکھتا

مواصلات کا پورا نظام تھا مفلوج
میں اپنے غم سے تجھے کیسے باخبر رکھتا

سجا رہے ہیں سبھی تیرگیِ شب عاصم
کوئی تو خواہشِ زیبائشِ سحر رکھتا

○

✧

بھائی بہنوں میں بٹ گئے کمرے
ہائے کمروں سے کٹ گئے کمرے

چور دیوار تو پھلانگ آئے
سامنے آئے ڈٹ گئے کمرے

لوٹ کر جب سفر سے آیا ہوں
والہانہ لپٹ گئے کمرے

نسل در نسل یہ مکان بٹا
صحن سکڑے سمٹ گئے کمرے

روزن و در دریچے بند رہے
دھول میں پھر بھی اٹ گئے کمرے

ساتھ آئے سفر میں چند قدم
سسکیاں لیں پلٹ گئے گھر سے

جن کے باعث ہوئے تھے یہ تعمیر
ان سروں پر سے ہٹ گئے گھر سے

شہر کی وحشتوں سے گھبرا کر
مجھ سے عاصم چمٹ گئے گھر سے

○

✧

کیا کہہ رہی ہے تیز ہوا اپنے آپ سے
یہ پوچھتا رہا ہے دیا اپنے آپ سے

جس نے رکھی ہے صلح سدا سارے شہر سے
وہ شخص ہو گیا ہے خفا اپنے آپ سے

اس پر کھلے گا کیسے کسی اور کا وجود
جو ساری عمر لپٹا رہا اپنے آپ سے

ہم نے خود اپنے آپ کو لوٹا ہے بارہا
لیکن کہاں حساب لیا اپنے آپ سے

کیوں کر رہے ہو میرے بدلنے کا تم گلا
میں نے تو کی نہیں ہے وفا اپنے آپ سے

کیسے سما سکے گا وہ اپنے وجود میں
جو شخص ہو گیا ہے بڑا اپنے آپ سے

مصروف ہیں ہم اپنی عداوت میں مستقل
ہم لوگ کر رہے ہیں جفا اپنے آپ سے

ہم لوگ اپنے آپ کو پہچانتے نہیں
ہم نے کیا گریز سدا اپنے آپ سے

عاصم بسم رہا جو زمانے کی آنکھ میں
اندر سے ہو گیا ہے جدا اپنے آپ سے

○

✧

ہم نے یہ کیا کمال سرِ دار کر دیا
اپنے غلافِ سر ہی کو دستار کر دیا

بے وصف روشنی سے لیا انتقام یوں
آنکھوں نے دیکھنے ہی سے انکار کر دیا

ہم کو سکھائی جس نے بھی ترکیبِ زندگی
ہم نے اسی کے جسم کو تلوار کر دیا

آلودگیِ گرد کے باعث ہواؤں نے
لینا ہر ایک سانس کا دشوار کر دیا

خود اپنے آپ نیند سے جاگے نہ راہبر
ہم کو سفر کے واسطے تیار کر دیا

ہے ضعفِ اعتقاد کی پھیلی ہوئی وبا
ہر ذہنِ کم شعور کو بیمار کر دیا

کمروں میں قید کر دیا ہم نے بہار کو
کھلنے سے پھول پھول کو بیزار کر دیا

عاصم امامِ شہر نے سجدے کئے فروخت
ایمان کو بھی زینتِ بازار کر دیا

○

✧

رہتا ہوں میں جہاں وہ نگر ہے خمار کا
خدشہ نہیں ذرا بھی کسی انتشار کا

کب ہم نے اپنے چاکِ گریباں کی فکر کی
ہم نے بھی انتظار کیا ہے بہار کا

مت دیکھ مجھ کو شک کی نظر سے تو اس طرح
یہ عشق ہے، یہ کھیل ہے سب اعتبار کا

ہوتی ہے ایک خاص انا انکسار میں
جھک جایئے کہ یہ بھی عمل ہے وقار کا

جو شخص اقتدار میں باقی نہیں رہا
کیوں زعم ہے ابھی بھی اسے اقتدار کا

جن کو نہیں ذرا بھی مزاجِ شناوری
منظر بتا رہے ہیں وہ دریا کے پار کا

جو کر رہے ہیں ظلم وہ یہ سوچ کر کریں
ہے کھیل سب یہ وقت کا اور اختیار کا

کس نے مرے مکان کو لوٹا ہے، کیا خبر
چہرہ اڑا ہوا ہے مگر پہرے دار کا

عاصم اسے بھی وعدہ خلافی کا شوق ہے
ہم کو بھی ایک خبط سا ہے انتظار کا

○

✧

خوش رنگ موسموں کے نئے خواب سوچئے
تازہ گلاب سوچئے مہتاب سوچئے

آتا نہیں ہے ابر کہیں دور تک نظر
کیسے بھرے گا صحن کا تالاب سوچئے

اک بارسوخ شخص کے آتے ہی بزم کے
تبدیل کیوں ہوئے سبھی آداب سوچئے

کمزور ہم نہیں تھے عدو بھی قوی نہ تھا
کیسے شکست ہو گئی اسباب سوچئے

بستی نشیب میں ہے رکاوٹ کوئی نہیں
کیونکر رکے گی یورشِ سیلاب سوچئے

دریا کوئی نہیں کہیں صحرا کے آس پاس
کیسے کریں گے زیست کو سیراب سوچئے

تالابِ قصرِ شاہ میں پانی بھرا ہوا
باقی تمام شہر ہے بے آب سوچئے

وسعت ابھی ہے روح میں باقی اگر تو کیوں
حد بن گئی ہے سجدے کی محراب سوچئے

عاصم نہیں ہے دل میں اگر خوف کوئی بھی
کمزور کیوں ہوئے ہیں یہ اعصاب سوچئے

○

اداریہ

(برطانوی روزنامہ ڈیلی میل کے ایک اداریے سے متاثر ہو کر [illegible])

عجیب سوچ ہے یہ مغربی صحافت کی
شعورِ حرمتِ میثاقِ منصفی ہی نہیں
انہیں قبول نہیں ہے بہار کا موسم
ذرا بھی فکر گلوں کو سنوارنے کی نہیں

وہ لوگ جن کو یہ دہشت پسند کہتے ہیں
ہیں ضربِ تیشۂ غاصب سے چوٹ کھائے ہوئے
ہیں ایک عمر سے پابند ان کی تقدیریں
عذابِ بازوئے قاتل سے تنگ آئے ہوئے

بسے بسائے گھروں سے انھیں نکالا تھا
دیارِ غرب کے خودساختہ خداؤں نے
دیا تھا اذن انھیں بے اساس سجدوں کا
حریمِ ارض کے مکروہ دیوتاؤں نے

عذاب و کرب میں زندہ ہیں آج بھی یہ لوگ
اس انتشار کو چالیس سال ہوتے ہیں
ہر ایک سانس پہ رائج ہے بدنیت قانون
قدم قدم پہ جواب و سوال ہوتے ہیں

ہے زیست قید کئی خاردار تاروں میں
جو نونہال ہیں اسکول جا نہیں سکتے
زمین ضبط ہوئی، فصل پہ لہو کا لگان
کسان پھاوڑا بھی اب اٹھا نہیں سکتے

جواں ہوئے ہیں جو اس بے گھری میں وحشت میں
وہ فتنہ فکر نہ ہوں گے اگر تو کیا ہوں گے
یہ لوگ امن کی آسودگی سے ناواقف
رہیں گے امن میں تو امن آشنا ہوں گے

یہ نفرتوں سے مرصع اداریے ایسے
طویل کرتے چلے جائیں گے عذاب کی رات
کسی کے ہاتھ نہ آئے گی چاہتوں کی سبیل
کسی زباں پہ نہ آئے گی کوئی پیار کی بات

ہمارے دور کے ہر ایک لکھنے والے کو
یہ چاہئے کہ محبت کا احترام کرے
کہیں بھی امن کی صورت اگر نظر آئے
تو اس کے پھولنے پھلنے کا انتظام کرے

○

آگ کی تہذیب

✧

ذہن کے صاف اور ستھرے دل کے سب کو اچھے لگتے ہیں
یہ معصوم یہ بھولے بچے سب کو اچھے لگتے ہیں

گلچیں کو الزام نہیں دو نوچنے والے اور بھی ہیں
پھول حسین اور رنگ برنگے سب کو اچھے لگتے ہیں

پھیلتی جاتی ہیں یہ حدیں کیوں پتھریلے شہروں کی جب
نہر کنارے گاؤں یہ پیارے سب کو اچھے لگتے ہیں

تیری جانب دیکھنے والے ہم ہی نہیں ہیں اور بھی ہیں
پیارے پیارے سندر چہرے سب کو اچھے لگتے ہیں

میرے رہنے سہنے پر تنقید نہ کر یہ ٹھیک نہیں
اپنے اپنے طور طریقے سب کو اچھے لگتے ہیں

93

جلتے ہوئے ہر ایک بدن کو ٹھنڈک پیاری ہوتی ہے
دھوپ کے شہر میں سائے گھنیرے سب کو اچھے لگتے ہیں

اندر کوئی اور چھپا ہے باہر آیا کوئی اور
لوگ یہ کیوں تونے پھوٹے سے سب کو اچھے لگتے ہیں

آپ ہی عاصم ایک نہیں شیدائی حسین مناظر کے
یہ سرسبز پہاڑی رستے سب کو اچھے لگتے ہیں

○

◇

روز کوئی انجانا اس کا پیکر ملتا ہے
ملتا کتنا کم ہے وہ جو اکثر ملتا ہے

ایک ہی جیسا ہر انسان کا رونا ہنسنا ہے
ایک ہی چہرہ سارے چہرے بن کر ملتا ہے

دیکھتا ہوں تو ہر اک چیز ہیولی لگتی ہے
ہر منظر کے پیچھے ایک ہی منظر ملتا ہے

غیر وطن میں آ کر ایک مکان بنایا ہے
گھر کہتا ہے اس کو اپنا، بے گھر ملتا ہے

گلے لگانے والوں کے تھے ہاتھ اگر خالی
پشت میں کیوں پیوست مجھے یہ خنجر ملتا ہے

دل کے اندر ٹوٹ گیا ہے عاصم ہر اک بند
چڑھتا ہوا پانی سینے کے اندر ملتا ہے

○

✧

ان لوگوں کا اپنے آپ سے یہ سمجھوتا رہتا ہے
کچھ نہیں کہنا دیکھتے رہنا، جو کچھ ہوتا رہتا ہے

اس کے اندر رہنے والا شاعر ہے یا دیوانہ
اپنے آپ سے باتیں کر کے ہنستا روتا رہتا ہے

قتل کا ہر اک منظر گویا کوئی بھیانک خواب ہوا
کون گواہی دے گا یہاں یہ شہر تو سوتا رہتا ہے

آنکھیں موند کے لیٹ گیا ہوں نیند کا آنا مشکل ہے
اندر ہی اندر سے کوئی سوئی چبھوتا رہتا ہے

مشکیزے میں پانی کم ہے اور سفر صحرا کا طویل
قطرہ قطرہ ایک مسافر ہونٹ بھگوتا رہتا ہے

کس نے ضبط کے ہر اک بند کو دھیرے دھیرے توڑ دیا
چپکے چپکے میرے اندر کون یہ روتا رہتا ہے

کھیت ہے بنجر، دھوپ مسلسل، بارش کا امکان نہیں
بھوکے بچے، آس برابر، گیہوں بوتا رہتا ہے

کوزۂ جہل سے کیسے عاصم آبِ طریقت نکلے گا
کیوں کر روح کی میل دھلے گی گرچہ دھوتا رہتا ہے

○

✧

میں عشقِ زخم زدہ کو وفائیں کیسے دوں
خود اپنے دل کو مسلسل سزائیں کیسے دوں

بہت قریب ہے چاہوں تو ہاتھ سے چھولوں
ہوں اتنا دور میں اس کو صدائیں کیسے دوں

چھپا لیا ہے بدن بے لباس سجدوں میں
برہنہ روح کو لیکن قبائیں کیسے دوں

ہے حد ضرور کوئی مشقِ درگزر کی بھی
ہر ایک دشمنِ جاں کو دعائیں کیسے دوں

علاج بھی ہے وہی جو مرض کا باعث ہے
میں دل کے درد کو عاصم دوائیں کیسے دوں

○

✧

جو لوگ محو رہے ہیں شکار میں اپنے
گھرے ہوئے ہیں وہ خود ہی حصار میں اپنے

کوئی کسی سے نہ ٹکرائے ٹوٹ کے نہ گرے
ہر ایک شخص رہے گر مدار میں اپنے

پڑاؤ بنتی گئی آگہی کی ہر منزل
شکوک پیدا ہوئے اعتبار میں اپنے

نہیں ثبوتِ سفر صرف پاؤں کے چھالے
اٹے ہوئے ہیں بدن بھی غبار میں اپنے

سکھا رہے ہیں مجھے کام کاج میرا وہ
جو کامیاب نہیں کاروبار میں اپنے

میں انتظام کیے جا رہا ہوں کل کے لئے
اور ایک پل بھی نہیں اختیار میں اپنے

ہمارے خون کی پہچان پھول پھول میں ہے
ہوئے ہیں رنگ نمایاں، بہار میں اپنے

ہوا نہ ختم کبھی ذات کا سفر عاصم
ہوں ایک عمر سے میں انتظار میں اپنے

○

✧

یوں سردیوں کی دھوپ میں جل کے پگھل گئے
جیسے یہ لوگ برف کے سانچے میں ڈھل گئے

ان کی روش نئی ہے مگر سوچ ہے قدیم
یہ لوگ اپنے آپ سے آگے نکل گئے

کتنے ہی گھر رہے ہیں اندھیروں کی قید میں
بیکار یہ چراغ مقابر پہ جل گئے

بازار باشعور کا تاجر ہے کم نظر
سکے کھرے نہیں تھے مگر پھر بھی چل گئے

کچھ ایسا تنگ دست خریدار ہو گیا
سارے ثمر درخت کی شاخوں پہ گل گئے

وقتِ وداع وہ ہی ہوا جس کا خوف تھا
آنکھوں میں جتنے اشک تھے سارے ابل گئے

تبدیلیٔ امیرِ حکومت کے ساتھ ہی
قانون میرے شہر کے یکسر بدل گئے

عاصم کشش زمیں کی اگر کم نہیں ہوئی
جو لوگ گر رہے تھے وہ کیسے سنبھل گئے

○

✧

راجہ کی دھن دولت کو رانی نے سنبھالا کوئی نہیں
تاج میں ہیرا ایک نہیں، سونے کی مالا کوئی نہیں

جس گھر کو ویران ہوئے اک عمر ہوئی حیرت ہے وہاں
فرنیچر پہ گرد نہیں، مکڑی کا جالا کوئی نہیں

راستہ ناہموار، اندھیرا، بجلی، بارش، تیز ہوا
جسم توانا، عزم نڈر، تلووں میں چھالا کوئی نہیں

میرے لئے تو سارے چہرے روشنیوں کے چہرے ہیں
میری آنکھ میں بھورا، پیلا، گورا کالا کوئی نہیں

باہر سے ہر ایک مکاں میں شور سنائی دیتا ہے
اندر جھانک کے دیکھتا ہوں تو رہنے والا کوئی نہیں

جس بارش نے شہر کے ہر اک کچے گھر کو قتل کیا
پھول یا پتہ ایک بھی اس نے باغ میں پالا کوئی نہیں

ساری کمائی اپنی جس کے پاس امانت رکھ دی ہے
عاصم تم نے اس کو پرکھا، دیکھا بھالا کوئی نہیں

○

✧

اپنے سلوک پہ وہ پشیماں ہوا تو ہے
تھوڑا سا میرے درد کا درماں ہوا تو ہے

چوروں کا خوف ہے تو ابھی بھی مجھے مگر
کوئی مرے مکاں کا نگہباں ہوا تو ہے

بے حس ابھی بھی شہر ہے سارا مگر یہ سوچ
اب کے کسی کے قتل پہ حیراں ہوا تو ہے

ہر آنکھ گل شناس نہیں شہر میں مگر
کچھ اہتمامِ جشنِ بہاراں ہوا تو ہے

مانا کرن ہر ایک ابھی معتبر نہیں
بستی میں انتظامِ چراغاں ہوا تو ہے

جس نے غریبِ شہر سے چھینی قبائے شرم
وہ شخص اپنی آنکھ میں عریاں ہوا تو ہے

آوارگیٔ شوق پہ کرتے ہیں لوگ طنز
مشہور اپنا چاکِ گریباں ہوا تو ہے

عاصم بہار آئی نہیں ہے ابھی مگر
گلہائے رنگا رنگ کا امکاں ہوا تو ہے

○

ساحل کے عذاب

(کراچی)

سمندر پہ اداسی چھا گئی ہے
کہیں ساحل پہ کوئی ایک بھی بچہ نہیں بیٹھا
محل اب ریت کے
کوئی نہیں تعمیر کرتا
بہت سی سیپیاں بکھری پڑی ہیں
کوئی چنتا نہیں ہے
اکیلی ایک مرغابی
سسکتے ڈوبتے سورج کو بیٹھی دیکھتی ہے
سمندر کے کنارے پہ جو بستی ہے
وہاں

آسیب نے گھر کر لیا ہے
پڑاؤ موت نے ڈالا ہوا ہے
گھروں کے بند دروازوں کے پیچھے
شکستہ زندگی سہمی ہوئی ہے
ہوائیں نفرتیں اوڑھے ہوئے ہیں
محبت کے بدن پر ہے قبائے زخم آلودہ
خدا مکروہ جذبوں کا حوالہ بن گیا ہے
ہر اک سجدے کی پیشانی کی حد پر
سجی ہے خوف کی محراب
عبادت گاہ مقتل ہے
درندے آدمی کا روپ دھارے
دندناتے پھر رہے ہیں
فضا میں گونجتی ہیں
گولیوں کی بدنما چیخیں
گزشتہ ہجرتوں کے پاؤں کی آہٹ ہے کانوں میں
مگر اب آنے والے قافلوں کو
لگاتا ہی نہیں کوئی گلے سے
مہاجر ہو گئے ہیں لوگ
خود اپنے مکانوں میں
حفاظت کے سفر کے واسطے تیار بیٹھے ہیں
مگر ہجرت کے ہر اک راستے پر قتل گاہیں ہیں
تعاقب میں ہر اک زندہ بدن کے

کئی خونی نگاہیں ہیں
جنوں پہ کوئی پابندی نہیں ہے
خرد محبوس ہے
فہم و فراست
مشتعل ذہنوں سے خائف ہے
وہ بستی اپنے ہاتھوں
قتل ہوتی جا رہی ہے
اسے اندر سے دیمک کھا رہی ہے
کہیں ایسا نہ ہو
ساحل کی ویرانی سے اکتا کر سمندر
سرحدیں اپنی بڑھا دے
محبت کو ترستے ہیں
یہ سارے لوگ بستی کے
انہیں ماں کی طرح
آغوش میں اپنی چھپا لے

✧

سو گئے ذکرِ صبح کر کر کے
لوگ اس شہرِ خواب پرور کے

ان چٹانوں کو دیکھ کر یہ کھلا
زخم بھرتے نہیں ہیں پتھر کے

پست قد ہیں تمام دیواریں
راز کیسے چھپاؤں گا گھر کے

آپ بس اک طرف سے دیکھتے ہیں
زاویے اور بھی ہیں منظر کے

وہ بھی مصروفِ بندگی ہے کہ جو
کر رہا ہے گناہ ڈر ڈر کے

جس کو ذوقِ درون بینی ہے
وہ ہی دیکھے گا زخم اندر کے

کیا ڈریں گے وہ موت سے جو لوگ
زندگی کر رہے ہیں مر مر کے

مرغِ بسمل کی فکر کی سب نے
کس نے دیکھے تھے زخم خنجر کے

یہ مساوات ہے عجب عاصم
لوگ ملتے نہیں برابر کے

○

✧

اب جی کے سنبھلنے کا بہانہ نہیں ملتا
رونے کے لئے ایک بھی شانہ نہیں ملتا

کر غور ذرا اپنے وطیرے پہ مری جاں
یہ سوچ کہ کیوں تجھ سے زمانہ نہیں ملتا

ہر ہم سفرِ دل ہے ہیولیٰ کوئی گویا
ہوتا ہے مرے ساتھ روانہ' نہیں ملتا

آنکھیں بھی ہدف آشنا ہیں تند کماں بھی
تیروں کو مگر پھر بھی نشانہ نہیں ملتا

کھودی ہے زمیں ہم نے کئی بار اگرچہ
ملتے ہیں کھنڈر ہم کو خزانہ نہیں ملتا

ہے اپنی مثال ایسے مسافر کی سی عاصم
منزل پہ جسے کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا

○

✧

کم ذرا تو جسم کا ہیجان کر
ست اپنے خون کا دوران کر

آئنوں کو توڑ دیتے ہیں یہ لوگ
اپنی اپنی صورتیں پہچان کر

ذہن میں ہونے بھی دے سورج طلوع
چشمِ کم احساس پہ احسان کر

بیج بونے کے لئے مٹی سنوار
فصلِ گل کا کوئی تو سامان کر

منصفینِ شہر دیتے ہیں سزا
بے گناہی کی دلیلیں مان کر

کس طرح تجھ کو کہوں گا بے وفا
میں تری مجبوریوں کو جان کر

پھر غریبوں کو شعور آنے کو ہے
پھر کسی خیرات کا اعلان کر

جسم کو آلودگی سے پاک رکھ
سانس لے عاصم ہوائیں چھان کر

○

✧

اگا سکے ہی نہیں باہنر شجر کوئی
نصیب ہو گا ہمیں کس طرح ثمر کوئی

بہ فیضِ علمِ طریقت ہراس روح میں ہے
مگر نہیں ہے بدن میں مقیم ڈر کوئی

ہوُا بہار کا یہ اہتمام کس کے لئے
نہیں ہے شہر میں گل آشنا نظر کوئی

بنا یہ قافلہ کیسے قریب منزل کے
نہیں تھا راہ میں تو میرا ہمسفر کوئی

ضمیر صرف امیرانِ شہر نے بیچا
جھکا نہ شاہ کے آگے غریب سر کوئی

ہر ایک شخص کو شکوہ ہے تیرگی کا مگر
کسی نگاہ میں رقصاں نہیں شرر کوئی

ہے روزگار کی قلت شدید بستی میں
چھپا کے کیسے رکھے دستِ باہنر کوئی

نہیں ہیں صرف یہ چہرے ہی مختلف عاصم
لہو بھی ایک سا رکھتا نہیں ہے ہر کوئی

○

✧

جو بھی روپ سجالے لگتا نقلی ہے
جانے تیرا کون سا چہرہ اصلی ہے

سارے مچھیرے جال اٹھا کر آپہنچے
اور دریا کے اندر ایک ہی مچھلی ہے

جس کو سینچا ہم نے اپنا خوں دے کر
گلچیں نے وہ ایک کلی ہی مسلی ہے

سارا خزانہ شہر کا خالی ہے تو پھر
کیسے جیب افسر نے اپنی بھرلی ہے

پچھلی نسل کی عزت لازم ہے لیکن
اس کی بھی تعظیم کرو جو اگلی ہے

اچھے دام لگیں گے شادی منڈی میں
پڑھی، لکھی، سگھڑ ہے دبلی پتلی ہے

ہم نے فرسودہ رسموں کو چھوڑ دیا
ہم جیسوں نے عاصم دنیا بدلی ہے

○

✧

عاصم مری زمیں کے خزینے کہاں گئے
جو جگمگا رہے تھے نگینے کہاں گئے

ناآشنائے آب یہ بے وصف ناخدا
لہروں سے پوچھتے ہیں سفینے کہاں گئے

اہلِ صفات چھوڑ گئے شہرِ بے ہنر
پوچھا کبھی نہیں یہ کسی نے کہاں گئے

رستہ فراز کا کوئی آتا نہیں نظر
اترے تھے جو نشیب میں زینے کہاں گئے

ہر شخص مبتلا ہے کسی امتحان میں
آسان زندگی کے قرینے کہاں گئے

ہر سال ایک لمحے کی مانند ہو گیا
دن رات کیا ہوئے وہ مہینے کہاں گئے

بے جان جسم شہر میں پھرتے ہیں چار سو
جو زندگی مزاج تھے جینے کہاں گئے

عاصم غریب شہر کا ہے ایک ہی سوال
اگلے تھے جو زمیں نے دفینے کہاں گئے

○

✧

بسا ہوا شہر ہے مگر مکڑیوں کے جالے پڑے ہوئے ہیں
شدید خطرہ ہے ڈاکوؤں کا، گھروں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں

تمام آنکھیں قدیم تاریخ کے حوالے سے دیکھتی ہیں
نقوش دیوارِ دورِ نو کے تمام کالے پڑے ہوئے ہیں

جو لوگ سورج کے شہر میں تشنگی سے مجبور ہو گئے تھے
ہتھیلیاں ہیں فگار ان کی، لبوں پہ چھالے پڑے ہوئے ہیں

کہاں کا دشمن ہمیں ہوئی ہے شکست خود اپنی سازشوں سے
خود اپنے ہاتھوں ہی قتل ہو کر سبھی جیالے پڑے ہوئے ہیں

ہر ایک بے وصف آدمی لگ رہا ہے ہم کو فرشتہ سیرت
ہماری آنکھوں کی روشنی ہی کے گرد ہالے پڑے ہوئے ہیں

کچھ اس طرح پھیلتی چلی جا رہی ہے تہذیب آدمی کی
کہ جنگلوں میں بھی اب درندوں کو جاں کے لالے پڑے ہوئے ہیں

نہیں ہے ان ناخداؤں ہی کو شعور تعلیمِ نو کا عاصم
وگرنہ رستہ بجھانے والے تمام آلے پڑے ہوئے ہیں

○

جرأتِ کفر

مرے خدا مرے شہرِ ستم رسیدہ میں
تری وفا کے حوالے سے ظلم ہوتے ہیں
جو لوگ تیری محبت کے گیت گاتے ہیں
وہ نفرتوں کے پیمبر عذاب بوتے ہیں

ستم پرست ہیں خنجر بدست رہتے ہیں
لہو کے رنگ سے بھرتے ہیں رنگ سجدوں میں
نہیں ہیں دل سے تو صوم و صلواۃ کے پابند
گناہ کرتے ہیں لیکن، چھپا کے پردوں میں

یہ تیرے دین کے مختار بن کے بیٹھے ہیں
نبھا رہے ہیں مگر کفر کے عقیدوں سے
حسین ہوتے چلے جا رہے ہیں سارے شہید
بھرا ہوا ہے مرا شہر ان یزیدوں سے

یہ لوگ شہر کی خوش حالیوں کے دشمن ہیں
ہر ایک ذہن شکستہ ہے یرغمال ان کا
چلائی رسم، کرے قتل بھائی بھائی کو
محبتوں پہ عقیدہ ہے پائمال ان کا

مرے خدا مری معصوم جرأتوں کو تو دیکھ
ستم گروں کی روش کے خلاف بولتا ہوں
ہے کفر جن کی نظر سے نظر ملانا بھی
میں آج ان کے مخالف زبان کھولتا ہوں

مرے خدا مرے شہرِ ستم رسیدہ کو
عذابِ رسمِ ستم سے نجات مل جائے
مرے خدا مرے شہر ستم رسیدہ میں
محبتوں کا شگفتہ گلاب کھل جائے

○

✧

آئنے دیدہ ور نہیں ہوتے
عکس بھی خودنگر نہیں ہوتے

وہ بھی اڑنے کا شوق رکھتے ہیں
جن پرندوں کے پر نہیں ہوتے

گھر میں ملتا اگر سکون آرام
لوگ یوں دربدر نہیں ہوتے

وہ اندھیرے میں دیکھ لیتے ہیں
جن کی آنکھوں میں ڈر نہیں ہوتے

خوف ہوتا نہیں ہے لٹنے کا
ساتھ جب ہم سفر نہیں ہوتے

آنچ اٹھتی نہیں ذرا سی بھی
راکھ میں جب شرر نہیں ہوتے

نیند ان کو بھی آ ہی جاتی ہے
جن کے محفوظ گھر نہیں ہوتے

کاش آ جائے یہ سمجھ عاصم
راہ زن راہبر نہیں ہوتے

○

✧

فون گم سم’ بانگِ در خاموش ہے
آج تو یہ گھر کا گھر خاموش ہے

مانگتے ہیں ٹوٹتے پتے حساب
اور بے چارہ شجر خاموش ہے

پر شکستہ’ اور شجر پر آشیاں
اک پرندہ خاک پر خاموش ہے

لٹ گیا ہوں’ راہ زن کوئی نہیں
راہ بر چپ’ ہم سفر خاموش ہے

جل اٹھا شعلہ تو چنگاری چھپی
آگ کے اندر شرر خاموش ہے

بڑھتی جاتی ہیں ہماری الجھنیں
اور ہمارا چارہ گر خاموش ہے

کپکپی طاری ہے عاصم روح پر
میرے اندر میرا ڈر خاموش ہے

○

✧

عکس کیسے دیکھتا مہتاب میرے شہر کا
ہو گیا تھا خشک ہر تالاب میرے شہر کا

دیدۂ محکوم میں آزاد تعبیریں نہ تھیں
بے ہنر آنکھوں نے دیکھا خواب میرے شہر کا

خاک کی تہہ میں کہیں کھویا ہوا ہے آج تک
ہر نگینہ قیمتی نایاب میرے شہر کا

گھر کے دروازے پہ کوئی ریت کی بوری نہیں
اور سرکش مشتعل سیلاب میرے شہر کا

اس قدر بچوں نے پانی میں بنائے دائرے
پتھروں سے بھر گیا تالاب میرے شہر کا

سو گئے سارے محافظ، دشمنوں پہ کھل گیا
کتنی آسانی سے عاصم باب میرے شہر کا

○

✧

افق کی گود میں سمٹا ہوا سویرا ہے
نظر نظر میں چمکتا ہوا اندھیرا ہے

شعور وقت کا بھی اب نہیں رہا ہے مجھے
نجانے کب سے مجھے انتظار تیرا ہے

میں در دریچے سبھی بند کر کے قید ہوا
سنا ہے شہر میں آزاد اک لٹیرا ہے

جو اپنے جال پہ کرتا ہے طنزِ ناکامی
وہ اپنے آپ ہی ہارا ہوا مچھیرا ہے

ہے کیمیائی توازن الگ الگ سب کا
دوا بنے گا کسی کی جو زہر میرا ہے

جہاں سے آنے لگی تھی مجھے نظر منزل
اس مقام پہ اب تک مرا بسیرا ہے

جو تجھ کو دیکھنا چاہے وہ دیکھ لے مجھ کو
میں آئنہ ہوں مرا نقش تیرا ہے

جہاں بھی جائیں درندوں کا خوف ہے عاصم
ہمارے گرد گھنی وحشتوں کا گھیرا ہے

○

✧

بڑے مکان رسوخ و اثر کی بیماری
ہے عام شہر میں توقیرِ زر کی بیماری

سفر تو سخت نہیں تھا مگر بنی زنجیر
قدم قدم پہ مرے ہمسفر کی بیماری

یہ تیرہ فکر ہیں ایسے کہ ہو گئی ان کو
کتابِ نور کے پڑھنے سے ڈر کی بیماری

ہر ایک جسم نے بھگتے مرض وراثت کے
ثمر کو چاٹ رہی ہے شجر کی بیماری

غلط روی کو غلط ہی نہیں کبھی سمجھا
یہی رہی ہے مرے راہ بر کی بیماری

میں کیا کروں کہ سبھی بام و در ہیں پستہ قد
چھپا سکوں گا نہیں اپنے گھر کی بیماری

جو میکدہ نہیں فعال ہے تو کیوں عاصم
ہے عام شہر میں ذہن و جگر کی بیماری

○

✧

مجھ کو کسی کے عکس نے ڈھانپا ہوا نہیں
میں نے لباسِ آئنہ پہنا ہوا نہیں

جس نے تمام شہر کو بدنام کر دیا
وہ شخص اپنے آپ تو رسوا ہوا نہیں

ہم نے محبتوں کو دیا ہے نیا مزاج
دل تیری بے وفائی سے ٹوٹا ہوا نہیں

آزادیِ حیات مکمل نہیں مگر
ہر شخص اب کے شہر میں سہما ہوا نہیں

ہو گی یہ بے وفائی اگر چشمِ شوق میں
وقتِ وصال تیرا سراپا ہوا نہیں

ہم نے کیا ہے قتل اندھیروں کو بار بار
لیکن کہیں ذرا سا اجالا ہوا نہیں

محدود ہو گئی ہے ہر اک سوچ کی اڑان
قطرہ کسی نگاہ میں دریا ہوا نہیں

کیوں طے نہیں کیا ہے ذرا سا بھی فاصلہ
عاصم اگر یہ قافلہ ٹھہرا ہوا نہیں

○

رسمِ شہر

شہر میں پیار کی ہر ایک ادا پہ پہرہ
اتنی چاہت سے مجھے ایسی محبت سے نہ دیکھ
منظرِ کذب و ریا ثبت ہے آنکھوں پہ یہاں
اتنی بے لوث عقیدت سے صداقت سے نہ دیکھ

جنبشِ چشمِ کرم صرف روا خلوت میں
عشق بے حرف و نوا، رسمِ محبت مایوس
مذہبِ شہر ہے نفرت کے عقیدوں کا نصاب
کاسۂ لطفِ تہی، چشمِ عقیدت مایوس

کجکلاہانِ طریقت ہیں بہت شرانگیز
گمرہی کا کوئی کردار بنا لیں گے تجھے
اپنی آنکھوں کو جھکا میری طرف یوں نہ اٹھا
ورنہ یہ لوگ حیادار نہ مانیں گے تجھے

○

✧

تیرے میرے درمیاں یہ فاصلے
قربتوں کے وہ گماں یہ فاصلے

اک پرندہ پربریدہ خاک پر
اور شجر پر آشیاں یہ فاصلے

یاد رکھنا ہے ترا پیکر تمام
لے رہے ہیں امتحاں یہ فاصلے

دور کر سکتی نہیں یہ دوریاں
فاصلوں کا ہیں زیاں یہ فاصلے

اپنی مٹی سے ہے جو رشتہ مرا
توڑ سکتے ہیں کہاں یہ فاصلے

منزلیں عاصم قریب آتی نہیں
ساتھ ہیں گویا رواں یہ فاصلے

○

✧

جمالِ عکس سیاہی کو آزماتا رہا
میں آئینے کے مقابل دیئے جلاتا رہا

ذرا بھی یاد نہ آئی تھی جن کی برسوں میں
بلاسبب وہ مجھے آج یاد آتا رہا

شعور و فکر کے سارے چراغ گل کر کے
کتابِ نور کی آیات گنگناتا رہا

تمام رات کیا اس نے رقص آنکھوں سے
نظر ملاتا رہا اور نظر چراتا رہا

کچھ اس قدر تھا مسیحا پر اعتبار مجھے
خوشی سے میں نے پیا زہر، وہ پلاتا رہا

دے آگہی مرے سجدوں کو آج تک تو میں
فقط بہ رسمِ زمانہ یہ سر جھکاتا رہا

دیئے تھے اس نے مجھے چند پھول تحفے میں
جگہ جگہ انہیں کمرے میں، میں سجاتا رہا

بدل کے نام مقامات اور لوگوں کے
وہ لفظ لفظ کہانی مری سناتا رہا

اسی کی آنکھ کا کانٹا سا بن گیا ہوں اب
میں جس کی راہ کے کانٹے سدا اٹھاتا رہا

کوئی تو تھا جو مرا ہاتھ تھام کے عاصم
سیاہ رات میں بھی راستہ دکھاتا رہا

○

✧

بدن کو چاہتی ہے چیرنا تلوار بارش کی
مسلسل تیز ہوتی جا رہی ہے دھار بارش کی

یہ لگتا ہے بہا لے جائے گا سیلاب بستی کو
نہیں آتی ہے کم ہوتی نظر یلغار بارش کی

ہوا بستی میں پھولوں کو کہیں کھلنے نہیں دیتی
ہوئی جاتی ہیں ساری کوششیں بیکار بارش کی

وہ جانا چاہتا ہے روک لے اس کے قدم یارب
کھڑی رستے میں کردے مستقل دیوار بارش کی

ہوئے جاتے ہیں یہ کچے مکاں انبار کیچڑ کا
مگر دیتے نہیں کوئی خبر اخبار بارش کی

مکانوں کی چھتیں کمزور ہیں اور مشتعل پانی
مکیں سہمے ہوئے ہیں دیکھ کر رفتار بارش کی

اگے گی فصل تو عاصم وہی آہستہ آہستہ
زمیں زرخیز ہو یا معتدل مقدار بارش کی

○

✧

کسی نظر میں کوئی بھی حسین خواب نہیں
سفر ہے دشت کا اور آنکھ میں سراب نہیں

دیا ہے جس کے لئے خون نوجوانوں نے
ابھی تو شہر میں آیا وہ انقلاب نہیں

چمن میں ہوتی رہیں بارشیں لہو کی مگر
کھلا کہیں بھی کوئی سرخ رو گلاب نہیں

نجانے خوف زدہ ہو گئیں ہیں کیوں چڑیاں
فضاؤں میں تو کہیں بھی کوئی عقاب نہیں

نہیں بدن کی مشقت نماز کا مفہوم
جھکے نہ روح اگر ساتھ تو ثواب نہیں

یہ شہرِ علم گزشتہ ہے، حال سے منسوب
یہاں کسی کو میسر کوئی کتاب نہیں

خود اپنے آپ میں ہر شخص قید ہے عاصم
مگر کسی کو رہائی کا اضطراب نہیں

○

✧

گزرے ہوئے دلچسپ زمانے یاد آئے
آج بہت سے یار پرانے یاد آئے

سارے کھلونے کھیل رہے ہیں آنکھوں میں
بچپن کے انمول خزانے یاد آئے

دل نے ایک پرانی البم کھولی تو
چہرے چند حسین سہانے یاد آئے

دیر گئے تک باتیں کرنا یاد آیا
باغوں میں مخصوص ٹھکانے یاد آئے

آیا شہر میں مدت بعد تو بھولے ہوئے
یہ منظر جانے پہچانے یاد آئے

چھٹی کے دن ریڈیو سننا یاد آیا
نورجہاں، رشدی کے گانے یاد آئے

اپنے شہر کی ابتر حالت دیکھی تو
عاصم مجھ کو چند گھرانے یاد آئے

○

✧

وہ روشنی کو سراپا حجاب کر دے گا
مری نگاہ کو اپنا نقاب کر دے گا

بہار ساز ہے ایسا لبوں کی سرخی سے
گلِ خزاں کو بھی مثلِ گلاب کر دے گا

وہ اپنے لمس میں رکھتا ہے اسقدر نشہ
مرے بدن کے لہو کو شراب کر دے گا

ہے خواب ساز وہ، آنکھوں میں ڈال کر آنکھیں
ذرا سی دیر میں ہی محوِ خواب کر دے گا

ہمارے شہر کا آئنہ شعبدہ گر ہے
کبوتروں کو بھی عکسِ عقاب کر دے گا

میں بحث کر کے بھی قائل نہ کر سکوں گا اسے
وہ چپ رہے گا مگر لاجواب کر دے گا

محبتیں بھی ہیں اس کی تجارتوں جیسی
ملے گا جب بھی دلوں کا حساب کر دے گا

یہ ناخدائے محبت ہے بے ہنر عاصم
ترا سفینۂ دل غرقِ آب کر دے گا

○

✧

بڑے مکان کی چھوٹی نشانیاں لے کر
محل سے رانیاں نکلی ہیں باندیاں لے کر

اسی نے کھیت اگائے تھے آج جو دریا
اتر گیا ہے سمندر میں بستیاں لے کر

انہیں کو زعم ہواؤں میں تیرنے کا بھی ہے
بلندیوں سے جو کودے ہیں چھتریاں لے کر

مری زمین کے سارے درخت کٹ بھی چکے
کھڑے ہیں لوگ یہ کیوں اب بھی آریاں لے کر

انہیں ذرا بھی تو پہچان موتیوں کی نہیں
سمندروں سے جو لوٹے ہیں سیپیاں لے کر

لگا زمیں سے اکھڑنے تو خودغرض طائر
شجر کو چھوڑ گئے اپنے آشیاں لے کر

اس ابر سے تھی کرم کی ہمیں بڑی امید
گرج رہا ہے سروں پہ جو بجلیاں لے کر

یہ لوگ اپنے مقدر کے سامنے عاصم
کھڑے ہوئے ہیں قطاروں میں عرضیاں لے کر

○

گئے سال کی آخری نظم

ہوا ہے سرد
بدن کپکپا رہا ہے مرا
جمی جمی سی فضا میں سسکتی سانسوں کو
دھواں بنا کے اگلتی ہے جسم کی چمنی
میں اپنے آپ سے خود بارہا لپٹتا ہوں
پر اپنے جسم کو محسوس کر نہیں سکتا
نہیں ہے جان مری انگلیوں کی پوروں میں
مگر میں پھر بھی
کھلے آسمان کے نیچے
اڑا رہا ہوں

ہوا میں گلاب جلتے ہوئے
خوشی سے بیٹی مری
تالیاں بجاتی ہے
اچھالتا ہوں میں چنگاریوں کو ڈرتے ہوئے
منا رہا ہوں
خوشی کا یہ جشن
کیسا جشن
گئے دنوں کی خوشی ہے
کہ آنے والوں کی
مرے قریب سے اب تک یہ وقت گزرا ہے
نظر بچا کے
بہت تیز تیز چلتا ہوا
مری نگاہ میں
ماضی کا جسم پھیلا ہوا
سکڑ رہی ہے مسلسل قبائے مستقبل
گزر گیا ہے
گیا سال
لے گیا کیا کیا
میں کیا کہوں
کہ ہوا سرد ہے
زبان پہ برف
جمے ہوئے ہیں کئی اشک میری آنکھوں میں

ہے ارد گرد مرے
جشنِ سالِ نو کا ہجوم
نگاہ ڈھونڈ رہی ہے
شناسا چہروں کو
مگر یہ سال جو پھسلا ہے
انگلیوں سے ابھی
وہ لے گیا ہے چرا کے نجانے کس کس کو
گزر رہا ہے
کہ یہ وقت رک نہیں سکتا
گزر چکا ہے جو لمحہ
پلٹ نہیں سکتا
اگر میں گذرا ہوا وقت پھر سے جی سکتا
تو ایک بار
انہیں اشتیاق سے ملتا
جواب نظر نہیں آتے ہجوم حاضر ہیں

✧

شیشے کے گھر نہ سوچئے مسمار کیوں ہوئے
تیشہ بدست پوچھئے مختار کیوں ہوئے

ان کے بدن قوی تھے وباؤں سے بے نیاز
یہ لوگ میرے شہر کے بیمار کیوں ہوئے

ہے میرا باغبان اگر بے ہنر تو پھر
گلشن میں یہ بہار کے آثار کیوں ہوئے

رستوں سے آشنا ہیں نہ منزل کی ہے خبر
ایسے سفر کے واسطے تیار کیوں ہوئے

جن کو شعورِ وسعتِ تحریر پہ ہے ناز
وہ قائلِ نوشتۂ دیوار کیوں ہوئے

مشہور خودپسند ہیں جو سارے شہر میں
وہ لوگ اپنے آپ سے بے زار کیوں ہوئے

ساری عدالتوں نے بری کر دیا جنہیں
اپنی نگاہ میں وہ گنہگار کیوں ہوئے

مانا سحر ہوئی ہے مگر سو رہے ہیں سب
عاصم بس ایک آپ ہی بیدار کیوں ہوئے

○

✧

اس شہر میں کیوں رونقِ بازار نہیں ہے
کوئی بھی جہاں مفلس و نادار نہیں ہے

ہے تیز ہوا اور چھتیں گھر کی شکستہ
سر پہ بھی کوئی آہنی دستار نہیں ہے

جس شہر کی سرحد پہ ہے دشمن کا بسیرا
حیرت ہے وہاں کوئی بھی بیدار نہیں ہے

ہر شخص ہے سرچشمۂ تدبیرِ جہاد اور
مرنے کے لئے ایک بھی تیار نہیں ہے

یہ کیسے عجب زاویئے پر آگیا سورج
دونوں ہی طرف سایۂ دیوار نہیں ہے

مانا ہے وبا پھیلی ہوئی کذب و ریا کی
ہر شخص ابھی شہر کا بیمار نہیں ہے

سب کو ہے وہاں فرصتِ تکرارِ مسلسل
کہنے کو جہاں کوئی بھی بیکار نہیں ہے

ماخوذ ہے جو میری کہانی ہی سے عاصم
اس کھیل میں شامل مرا کردار نہیں ہے

○

✧

لوگوں سے ہوئی جتنی شناسائی زیادہ
محسوس ہوئی اتنی ہی تنہائی زیادہ

کیوں کوئی بہاروں کے نہ آنے کا گلا ہو
کی ہم نے خزاؤں کی پذیرائی زیادہ

کچھ لوگ بھی اس شہر کے کانوں کے ہیں کچے
کچھ آپ نے افواہ بھی پھیلائی زیادہ

کیوں ڈوبتے جاتے ہیں یہ مشاق شناور
دریا میں روانی ہے نہ گہرائی زیادہ

مربوط اندھیرا ہے مگر دیکھ رہا ہوں
آنکھوں میں سمٹ آئی ہے بینائی زیادہ

گر کوئی کمی حبس میں آئی ہی نہیں ہے
کیسے یہ دریچے سے ہوا آئی زیادہ

جو شخص گنہگار ہے محتاط ہے عاصم
معصوم ہے جس کی ہوئی رسوائی زیادہ

○

یو این او

اک بستی کے
اک کوچے میں
کچھ لوگوں نے
کچھ لوگوں کو
تکلیفیں دیں
اور ان پہ مسلسل ظلم کیا
بچوں کو اٹھایا نیزوں پر
بوڑھوں کے بدن پیروں کے تلے
روندے کچلے
ہر عورت کی
عزت کا بدن
مسمار کیا
جب چند جواں

سینہ تانے
اس ظلم کا رستہ روکنے کو
آگے آئے
تو ان کے بدن تلوار کئے
بستی کے باقی لوگوں نے
منظر یہ ظلم کا دیکھا تو
چلا اٹھے
یہ ٹھیک نہیں، یہ ٹھیک نہیں
فوراً پنچایت بیٹھ گئی
ہر ایک نمائندے نے کہا
اس ظلم کو روکنا لازم ہے
یہ فیصلہ سب نے مل کے کیا
ظالم کا رستہ روکیں گے
ہر ظالم ہاتھ کو ٹوکیں گے
کرنا ہے طلب ظالم سے حساب ظلم ضرور
مظلوموں کو
رہنے نہیں دینا ہے مجبور
پنچایت برخاست ہوئی
پھر کچھ نہ ہوا
اور ظلم مسلسل جاری رہا
*

✧

روگ بنا کے بیٹھ گیا ہوں ایسا تیرے وعدے کو
ہر آہٹ پر بے کل ہو کر کھولتا ہوں دروازے کو

اک مذہب کو ماننے والے ٹولیوں میں تقسیم ہوئے
سجدہ ہر کوئی کرتا ہے اپنے اپنے کعبے کو

ملنا جلنا رک سکتا ہے دل کے نقش نہیں مٹتے
یہ تو کہو کیسے توڑو گے اتنے پرانے ناطے کو

ہر جانب سے آنے والا پہلے گزرنا چاہتا ہے
روک لیا ہے اس کوشش میں سب نے ہی چوراہے کو

قافلے والے گزرے ہوئے منظر دوبارہ مانگتے ہیں
پیچھے مڑ کر دیکھنے والے کیسے چلیں گے آگے کو

یہ تو ساری ہی بستی ہے ٹوٹے پھوٹے لوگوں کی
کرتے پھرو گے یکجا آخر کس کس کے شیرازے کو

اس کی تو عادت ہے عاصم خود سے بڑھ کر بولتا ہے
بن سوچے تسلیم نہ کرنا اس کے کسی بھی دعوے کو

○

✧

ذرا سا دل میں مرے اضطراب رہنے دے
ہٹا تمام یہ پردے نقاب رہنے دے

بڑا لطیف سا نشہ ہے تیرے لمس کا بھی
کہیں یہ ٹوٹ نہ جائے شراب رہنے دے

میں نفرتوں کے کھلے دشت میں ہو سرگرداں
محبتوں کے نظر میں سراب رہنے دے

رہی نہ دل میں تمنا کوئی تو کیا ہو گا
ہیں ناتمام ابھی چند خواب رہنے دے

سفر سے لوٹ کے آیا ہوں ایک عمر کے بعد
مجھے گلے سے لگا لے حجاب رہنے دے

ہوا چمن میں نئے پھول کیا کھلائے گی
یہ ہی بہت ہے پرانے گلاب رہنے دے

اب اس کی یاد کو محفوظ کر، پلنگ کے پاس
یہ پھول چائے کی پیالی کتاب رہنے دے

ہے تیرے چال چلن کا تمام شہر کو علم
ہے ظاہری یہ ترا اجتناب رہنے دے

نہ پوچھ اس سے سبب بے وفائی کا عاصم
محبتوں کا نہ کر احتساب رہنے دے

○

✧

زندگانی کے لئے جیسے لہو لازم ہے
بالکل ایسے ہی مرے واسطے تو لازم ہے

ہو گیا تیرا وطیرہ بھی خدا جیسا ہی
تجھ سے ملنے کے لئے بھی تو وضو لازم ہے

شہر نفرت کا ہے یہ اس میں اگر عزت کی
ہے طلب آپ کو تو ایک عدو لازم ہے

اجرتیں نوکروں کی ہو گئیں ایسی عاصم
گھر کی زینت کے لئے نیک بہو لازم ہے

○

✧

بے معنی کر دو گے اپنے جملوں کو
حرفوں میں تقسیم نہ کرنا لفظوں کو

دور افق پر سورج ابھرا ہے لیکن
کون دریچوں سے نوچے گا پردوں کو

پتھریلے جنگل کی حدیں پھیلانا مت
شہروں میں تبدیل نہ کرنا قصبوں کو

جن کو سفر کا ذوق نہیں ہے خود کوئی
بیٹھ گئے ہیں روک کے سارے رستوں کو

ایک سا موسم راس نہیں آتا ہے کبھی
سرسوں، گیہوں اور چاول کی فصلوں کو

کرتے ہیں جو لوگ تجارت آئنوں کی
خود ہی نہیں پہچانتے اپنے چہروں کو

آئے نہیں جو ساتھ سفر میں چند قدم
وہ بھی سہلاتے ہیں اپنے تلووں کو

کب تک اس کو یاد کرو گے عاصم تم
کب تک آخر کھرچو گے ان زخموں کو

○

ہڑتال

پھولوں کو نوچنے کے لئے بے قرار ہیں
جتنے شجر ہیں چاہتے ہیں سب اکھاڑ دیں
ہے اختلاف ان کا کوئی باغبان سے
ضد کر رہے ہیں اپنے چمن کو اجاڑ دیں

○

تقدیر

نہ ہے کمال یہ میرا نہ ہے قصور ترا
کہ میرا دین ہے افضل ترے عقیدے غلط
اگر یقین ہے ہم کو خدائے برتر پر
بغیر حکم کے جس کے کہیں زمین پہ بھی
کسی چمن کے کسی پیڑ کا کوئی پتہ
ذرا لرزنا بھی چاہے لرز نہیں سکتا
اسی نے مجھ کو بنایا ہے اس نے تجھ کو بھی
کیا ہے پیدا مجھے اس نے جس گھرانے میں

وہاں جو دین روایت تھا میرا دین ہوا
جہاں ہوئی تری پیدائش اس جگہ رائج
تھے جس طرح کے عقیدے ترے عقیدے ہوئے
مجھے بھی میرے عقیدے ملے ہیں ورثے میں
تجھے بھی تیرے عقیدے ملے ہیں ورثے ہیں
نہ کچھ قصور ہے میرا نہ یہ کمال ترا
خدا نے ہم کو بنایا بنادیا جیسا
ہمیں یہ چاہیے ہم ایک دوسرے کا وجود
کریں قبول لگائے بغیر شرط کوئی

نصف گواہی

میری ماں نے مجھ کو سمجھ کا پہلا سبق سکھلایا
ٹھیک غلط کا فرق بہت باریکی سے سمجھایا
کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے کی تہذیب سکھائی
اپنا بوجھ اٹھانا اپنے پیروں پر دکھلایا
ہر تکلیف میں اپنی شفقت کا سایہ پھیلایا

میری بہن جو مجھ سے عمر میں آٹھ برس آگے ہے
اس نے مجھ کو بچپن میں کتنے ہی گن سکھلائے
شام ڈھلے تک بیٹھ کے سب اسکول کا کام کرایا
سائنس حساب انگریزی کے الجھے گچھے سلجھائے
یعنی مجھ کو آگے بڑھنے کے رستے دکھلائے

مجھ کو اب یہ خبر ملی ہے میرے شہر میں رائج
وہ قانون ہوا ہے جس میں ہو گی نصف گواہی
مجھ کو عقل سکھانے والی ماؤں اور بہنوں کی
عورت کی کم بینی ہے ایک جزوِ دینِ شاہی
قاضی کے آنکھوں میں ہے تاریکی اور سیاہی

میری ماں نے مجھ کو سمجھ کا پہلا سبق سکھلایا
میری بہن نے بچپن میں مجھ کو رستہ دکھلایا

○

بحرِ بے اماں

ہوا بے وصف ہے
مایوس کن ہے
ہمارے بادبانوں نے
بہت سے زاویے بدلے
مگر پھر بھی
کوئی کشتی لگی نہ راستے پر
ہماری کشتیاں ساری
سمندر میں بھٹکتی پھر رہی ہے
جزیرے دشمنوں کے
ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں
جو ہم پر درد کی بوچھاڑ کرتے ہیں
اگر ساحل کہیں کوئی
ہماری دسترس میں آنے والا ہو

تو بحرِ ظلم پرور
مسلسل سازشیں کر کے
بھنور کے دائروں میں قید کر لیتا ہے ہم کو
ہماری کشتیاں
اپنے بچاؤ کے لئے
آپس میں لڑتی ہیں
ہمارے ناخدا بد فکر ایسے
نہیں پہچانتے بالکل
سمندر کی روش
پانی کے پیچ و خم
کج ادا لہروں کے زیر و بم
ہمیں کیسے یقیں آئے
ہماری کشتیاں ساری کنارے جا لگیں گی
مسلسل خوف ہے ہم کو
سمندر میں
کہیں کوئی بڑا گہرا خلا ہے
یہ ساری کشتیاں آہستہ آہستہ
اسی جانب روانہ ہیں
اگر ان ناخداؤں نے
بھٹکتی کشتیوں کا رخ نہ بدلا
تو ہم نے ڈوب جانا ہے

*

آبدیدہ الفاظ

لفظ نوزائیدہ بچے کی طرح روتے ہیں
سایۂ مادرِ تحریر کہیں کوئی نہیں
سرد ہے گرمیِ آغوشِ کتب خانۂ علم
چشمِ پُر مغز کی زرخیز زمیں کوئی نہیں

کاسۂ ذہن میں خیراتِ زر و مال و متاع
کوئی کرتا نہیں تقسیم زکوٰۃِ تعلیم
علم کے سامنے سجدہ نہیں جائز لیکن
گنبدِ بیش بہا کی ہوئی لازم تکریم

جہلِ سفاک نے پیروں تلے روندے کچلے
حرف، ٹوٹے ہوئے پتوں کی طرح بکھرے ہوئے
جوڑ کر کون کرے لفظ میں تبدیل انہیں
دستِ خطاط کے بھی حوصلے ہیں ٹوٹے ہوئے

چشمۂ مدرسۂ شہر ہوا خشک ایسا
طالبِ علم سبھی تشنہ دہن پھرتے ہیں
کوچۂ علم ہے ویران کھنڈر کی صورت
حرص کی جھیل میں رنگین کنول کھلتے ہیں

یونہی دستور جہالت کا اگر جاری رہا
ذہن ہو جائیں گے مفلوج کسی روز تمام
بانجھ ہو جائیگی زرخیز ذہانت کی زمیں
آنکھ ہو جائے گی مکروہ اندھیروں کی غلام

کھولئے قفلِ درِ مدرسۂ شہرِ شعور
آیئے صاف کریں گردِ کتب خانۂ علم
پھر کوئی بو علی سینا کوئی البیرونی
پھر سے آباد کریں آیئے میخانۂ علم

*

✧

مرتبے کی دعائیں مانگتے ہیں
لوگ عمدہ قبائیں مانگتے ہیں

برہمی دیکھ کر سمندر کی
ناخدا آبنائیں مانگتے ہیں

کی نہیں ہیں جو نیکیاں اب تک
لوگ ان کی جزائیں مانگتے ہیں

دستِ گلچیں سے تنگ آکر پھول
فصلِ گل میں خزائیں مانگتے ہیں

بت بناتے ہیں برف کے یہ لوگ
دھوپ کی بھی دعائیں مانگتے ہیں

جن کی عاصم برہنہ روحیں ہیں
وہ مقدس عبائیں مانگتے ہیں

○

✧

ہے میرے واسطے سب کچھ مگر خدا تو نہیں
وہ شخص میرے وسیلوں کی انتہا تو نہیں

ہمیں بھی تیرے وطیرے کی ہے خبر جاناں
ہمارا حال بھی تجھ سے چھپا ہوا تو نہیں

ابھی سے شہر کے یہ لوگ سو گئے ہیں کیوں
افق کی گود میں سورج ابھی ڈھلا تو نہیں

جو منزلوں کے حسیں خواب میں ہے کھویا ہوا
ذرا سی دور بھی وہ قافلہ چلا تو نہیں

محبتوں میں رہی ہے طلب بہت جس کی
کبھی بنا وہ میری آخری دعا تو نہیں

ہوا تھا اپنے رویے پہ سخت شرمندہ
اس اعتبار سے ایسا ہو بے وفا تو نہیں

جو خود کو روشنیوں کا سبب سمجھتا ہے
چراغ بن کے دریچوں میں وہ جلا تو نہیں

یہ کھٹکھٹانے لگا کون میرا دروازہ
کہیں یہ تم تو نہیں ہو کہیں ہوا تو نہیں

غرورِ برتریٔ رائے ہے جسے عاصم
خود اپنے ذہن سے وہ شخص سوچتا تو نہیں

○

پیاس

جو لوگ بلندی پر رہتے ہیں
وہ دریاؤں کے پانی میں
اپنے میلے کپڑے دھوتے ہیں
بچوں کو نہلاتے ہیں
اپنے آپ نہاتے ہیں
اپنے بدن کی
اور ماحول کی
میل، غلاظت
دریاؤں میں گھول کے
میدانوں کی سمت روانہ کرتے ہیں

میدانوں میں رہنے والے
گرمی کے بھرپور تھپیڑے سہنے والے
پیاس کی شدت سے گھبرا کر
گندا پانی
پی جاتے ہیں

متفرق اشعار

بے گناہوں کے بدن ہاتھیوں کے پاؤں تلے
اور تا حدِ نظر کوئی ابابیل نہیں

ٹیلی ویژن پہ جو مقتل کا سماں ہے عاصم
یہ حقیقت ہے کوئی منظرِ تمثیل نہیں

○

ہر ایک سجدے کو دیتا ہوں آگہی کا شعور
خدا شناس ہوں یعنی خدا پرست نہیں

○

ہٹی ہے لفظ سے مدت کے بعد پابندی
یہ حرف کی بے تابیاں تو لازم ہیں

✧

میرے آنگن میں تمازت ترے گھر میں ٹھنڈک
گردشِ شمس ہوئی چھاؤں نے گھر بدلا ہے

✧

تمام شہر ہے جس بے حسی پہ آمادہ
مرا شعور تو اس کو گناہ جانتا ہے

✧

بڑھتی جاتی ہے دھوپ کی شدت
کوئی سایہ نظر نہیں آتا
دوستوں سے بھی خوف کھاتا ہوں
دشمنوں ہی سے ڈر نہیں آتا

✧

اتنی بھی اب بلند نہیں ہے فصیلِ شب
اک روز روشنی میرے آنگن میں آئے گی

وہ روشنی ہے کہ سورج کو ماند کر دے گی
جو آج کل مرے اندر کے آفتاب میں ہے

ہر ایک جسم کو تو قید کر دیا لیکن
کرو گے کیا کہ ہر اک روح اضطراب میں ہے

چند ایک لوگ صرف ہیں تحریر آشنا
باقی جو ہیں اسیرِ حروفِ کتاب ہیں

خوش آگئی ہے گویا شکستہ روی ہمیں
راہیں غلط ہیں اور منازل کے خواب ہیں

جن کو سفر میں راہ کی پہچان ہی نہ تھی
وہ لوگ منزلوں پہ بہت کامیاب ہیں

○

میں کہیں دور نہیں ڈھونڈ تو گھر میں اپنے
جھانک کے دیکھ ذرا دیدۂ تر میں اپنے

ہے یہاں پر تو ہر اک شخص ہی محراب جبیں
عیب رکھتا ہی نہیں کوئی نظر میں اپنے

○

حلیئے چہرے نام الگ ہیں شب خوں کے انداز الگ
ورنہ شہر کو لوٹنے والے سارے لیٹرے ایک سے ہیں

○

جھپٹ پڑتے ہیں وحشی ہاتھ دیواروں کے پیچھے سے
ہمیں اس شہر کی ہر رہگذر سے خوف آتا ہے
کہیں کر دیں نہ ڈاکو قتل مجھ کو جھنجلاہٹ میں
مجھے اس بے سروسامان گھر سے خوف آتا ہے

○

کیوں کامیابیوں کا کروں ذکر فخر سے
ناکامیوں نے بھی تو سکھائی ہے زندگی

○

اپنی کوئی پہچان نہیں شہر میں میری
ہر شخص مجھے تیرے حوالے سے ملا ہے

○

کرتا ہوں انہماک سے برسوں کا انتظام
اور ایک پل نہیں ہے مرے اختیار میں

○

کبھی شعلوں سے بھی جلتے نہیں تھے
مگر اب ایک چنگاری بہت ہے
بدن تندرست ہیں جن کے انہیں کو
مسلسل فکر بیماری بہت ہے
اٹھائے پھر رہا ہوں درد تیرا
اگرچہ بوجھ یہ بھاری بہت ہے

○

چپ ہے ذہانت بول رہے ہیں کند دماغ
اتھلی آوازیں ہیں گہری خاموشی ہے
ہر اک شخص کے اندر شور بپا ہے شاید
اسی لئے تو باہر ایسی خاموشی ہے

Bazm-i-Ilm-o-Fan Internati

12-Amberley Court, Leeds Road, Bradford 3. (